إِنْ أُرِيْدُ إِلَّا الْإِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ

ماہنامہ

البرہان

لاهور

اپریل ۲۰۱۹ء

مدیر ڈاکٹر محمد امین

اِنْ اُرِیْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ

ماہنامہ

البرہان

لاہور

اپریل ۲۰۱۹ء

مدیر ڈاکٹر محمد امین

قارئین کرام توجہ فرمائیں

ہم جانتے ہیں کہ البرہان کے اکثر قارئین اہل علم اور پڑھے لکھے افراد ہیں اور یہ کہ اس طرح کے لوگ بالعموم متوسط طبقے کے افراد ہوتے ہیں اور خود ان کے پاس اتنا سرمایہ نہیں ہوتا کہ جدید اور مذہبی تعلیم میں جس طرح کی اصلاح کے ہم علمبردار ہیں وہ اس کا کوئی تجربہ کرسکیں۔ لہٰذا قارئین سے درخواست ہے کہ وہ:

❁ اپنے اور اپنے حلقۂ احباب کے ذریعہ مالی طور پر خوشحال افراد سے رابطہ قائم کریں اور انہیں ہماری تجاویز کے مطابق نیا رول ماڈل سکول/ کالج/ یونیورسٹی یا دینی مدرسہ بنانے اور چلانے پر آمادہ کریں۔ یاد رہے کہ جدید تعلیم کے ادارے منافع بخش انداز میں بھی چلائے جاسکتے ہیں۔

❁ وہ ان افراد کو جو پہلے سے تعلیمی ادارے چلا رہے ہیں قائل کرنے کی کوشش کریں کہ اصلاح کے بغیر جدید نظامِ تعلیم فاسد اور مذہبی نظامِ تعلیم ناقص ہے لہٰذا وہ ہماری مشاورت سے ان کی اصلاح کی کوشش کریں۔

ہمتِ مرداں مددِ خدا

مدیر

ڈاکٹر محمد امین کی چند اہم تصانیف

٭ تدریس القرآن ① برائے معلمین	۱۹۰ صفحات
٭ تدریس القرآن ① برائے طلبہ وطالبات	۷۲
٭ تعلیمی اداروں میں تعمیر سیرت۔ ہینڈ بک و گائیڈ	۱۶۰
٭ ہمارا تعلیمی بحران اور اس کا حل	۴۵۰
٭ ہمارا دینی نظام تعلیم	۲۵۰
٭ تعلیمی ادارے اور کردار سازی	۱۷۰
٭ اسلامی سکول کے خدوخال	۸۰
٭ نصابِ مدنیؒ	۴۰
٭ اسلام اور تزکیۂ نفس (مغربی فکر کے ساتھ تقابلی مطالعہ)	۹۰۳
٭ حقیقتِ تزکیۂ نفس (سوالاً جواباً)	۶۰
٭ ترکِ رذائل (احمد جاوید)	۲۵۰
٭ مسلم نشاۃ ثانیہ۔ اساس اور لائحہ عمل	۳۰۰
٭ اسلام اور تہذیبِ مغرب کی کشمکش	۱۷۵
٭ اسلامی اور مغربی اصطلاحات کا تقابلی مطالعہ	۱۷۵
٭ عصرِ حاضر میں دین کا متوازن تصور	۷۰

ڈسکاؤنٹ سمیت
بدون ڈاک خرچ

کتاب محل دربار مارکیٹ لاہور، فون نمبر: 0321-8836932
مکتبہ البرہان، A-97 نیلم بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور،
فون نمبر: 0300-4354673

ماہنامہ البرہان لاہور
جلد ۲۳، شمارہ ۴، اپریل ۲۰۱۹ء/ رجب المرجب ۱۴۴۰ھ

مشمولات

○فکرونظر
ایمان جیت گیا اور ٹیکنالوجی ہار گئی | مدیر | ۴
○تعلیم وتربیت
۔نصاب کی اسلامی تشکیل | پروفیسر ملک محمد حسین | ۶
۔فنِ تدریس | پروفیسر عطیہ محمد الابراشی | ۱۰
۔ مسلم نوجوان اور شناخت کا بحران | ڈاکٹر محمد امین | ۱۷
۔مَیں نے زندگی سے کیا سیکھا | ۱۸
۔دینی مدارس کے طلبہ ۔مستقبل کیا ہے؟ | ڈاکٹر حافظ محمد زبیر | ۲۰
۔پاکستان اور یکساں نصابِ تعلیم | پروفیسر ملک محمد حسین | ۲۳
۔ دل پر معصیت کے اثرات اور نتائج | مولانا تنظیم عالم قاسمی | ۲۷
○اسلام اور پاکستان
اور کتاب مرگئی ۔نوجوان ویلنٹائن ڈے | محمد عاصم حفیظ | ۲۹
کیوں نہ منائیں؟ لبرل خواتین کی دینی اقدار سے کھلواڑ
○اسلام اور عصر حاضر
۔ افغان طالبان ۔خبردار، ہوشیار! | مدیر | ۳۳
۔ ردّعمل کی پیداوار جدید دینی تحریکیں | سید خالد جامعی | ۳۵
۔ مختصر خبریں، مختصر تبصرے | ۳۸
○اسلام اور مغرب
۔نیوزی لینڈ میں مسلمانوں کا قتل عام | ڈاکٹر محمد امین | ۴۰
۔توہینِ رسالت ۔ نو استعماری حربہ | سعدیہ عمر شیخ | ۴۳
○تفہیم مغرب
۔ مغربی تہذیب ۔لبرل ازم کے نام پر جبر | سید خالد جامعی | ۴۷
۔مصنوعی ذہانت: مستقبل میں کیا گُل کھلائے گی؟ | پروفیسر نوح حریری | ۴۸
○مطالعۂ کتاب | قیوم نظامی
مغربی جمہوریت کی ناکامیوں پر فرانسیسی ماہر بشریات کی کتاب | ۵۶

فکر و نظر

ایمان جیت گیا اور ٹیکنالوجی ہار گئی

کہاں ہیں وہ لوگ جو کہتے تھے کہ قوموں کے عروج کا سبب سائنس و ٹیکنالوجی میں ان کی ترقی ہوتی ہے۔ مغرب اس لیے غالب ہے کہ وہ سائنس و ٹیکنالوجی میں ہم سے آگے ہے اور ہم اس لیے پسماندہ اور غیر ترقی یافتہ ہیں کہ ہم نے سائنسی تحقیق چھوڑ دی ہے؟

سترہ برس پیشتر جب امریکہ اور یورپ کے استعماریوں نے افغانستان پر حملہ کر کے ملا عمرؒ کی حکومت ختم کی تھی اور اس نے گوریلا جنگ کی ابتداء کی تھی تو اس نے کہا تھا ''افغانستان میں امریکیوں کی شکست یقینی ہے۔ آج یہ لوگ ہمارے ساتھ بات کرنے کو تیار نہیں لیکن ایک دن آئے گا جب یہ ہم سے مذاکرات کی بھیک مانگیں گے۔ یہ ایک پیشین گوئی ہے لوگ مانیں یا نہ مانیں لیکن ایک وقت آئے گا جب سب لوگ اسے مان جائیں گے۔''

اور آج ہم سب اس مردِ مجاہد کی پیشین گوئی کو اپنی آنکھوں سے سچ ہوتا دیکھ رہے ہیں۔ اگرچہ امریکہ Face Saving کی کوشش کر رہا ہے لیکن دنیا دیکھ رہی ہے کہ وہ افغانستان میں جنگ ہار چکا ہے اور کسی نہ کسی طرح اس سے جان چھڑانا چاہتا ہے۔ یہ کیسے ممکن ہوا؟ صرف جہاد کی برکت سے۔ جہاد کیا ہوتا ہے؟ اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے اپنی جان قربان کر دینا اور افغانوں نے اپنی جانوں کی قربانی دے کر مغربی ٹیکنالوجی کو شکست دے دی ہے۔

اس کے مقابلے میں ہم جیسے منافق ہیں جنہیں دین کے مقابلے میں دنیا اور اس کی مرغوبات عزیز تر ہیں حالانکہ قرآن حکیم نے واضح کر دیا ہے کہ:

''اے نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم، کہہ دو کہ اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے، اور تمہارے بھائی، اور تمہاری بیویاں اور تمہارے عزیز و اقارب اور تمہارے وہ مال جو تم نے کمائے ہیں، اور تمہارے وہ کاروبار جن کے ماند پڑ جانے کا تم کو خوف ہے اور تمہارے وہ گھر جو تم کو پسند ہیں، تم کو اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد سے عزیز تر ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ تمہارے سامنے لے آئے، اور اللہ فاسق لوگوں کی رہنمائی نہیں کیا کرتا۔'' [التوبہ ۹:۲۴]

اور ہم جیسے احمق ہیں جو مغرب کی لادین جمہوریت اور کفر پر مبنی سرمایہ دارانہ نظام میں اسلام کی معمولی پیخ لگا کر غلبہ اسلام کا خواب دیکھ رہے ہیں حالانکہ قرآن حکیم نے ہمیں صاف بتادیا ہے کہ ''اور جو شخص اسلام کے سوا کسی اور دین کا طالب ہوگا وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا'' [آل عمران ۳:۸۵] اور یہ کہ یہود و نصاریٰ ہمارے دشمن ہیں اور ہمیں دین سے دور کرنا چاہتے ہیں۔ اور دشمنوں کے وار اور سازشوں سے بچا جاتا ہے نہ کہ ان سے دوستی کی جاتی اور ان کی پیروی کی جاتی ہے۔ [آل عمران ۳:۱۱۸-۱۲۰، البقرہ ۲:۱۲۰]

ہم نے کفر کے خلاف جہاد کیا کرنا ہے، ہم سے تو یہ بھی نہیں ہوتا کہ کفر کی تہذیب کو ردّ کر دیں اور اپنے ایمان کی آبیاری کے لیے اپنا نظام تعلیم و تزکیہ ہی بدل لیں۔

کر سکتے تھے جو اپنے زمانے کی امامت
وہ کہنہ دماغ اپنے زمانے کے ہیں پیرو

شمع جلتی رہے

البرہان محض ایک جریدہ نہیں ایک مشن ہے۔ اگر آپ کو اس کے مضامین سے دلچسپی ہے تو کوشش کیجیے کہ یہ شمع جلتی رہے اور یہ شمع تبھی جلتی رہے گی جب آپ اس میں اپنے حصے کا تیل ڈالتے رہیں گے۔ خود بھی البرہان کے خریدار بنئے اور دوسروں کو بھی بنائیے۔

زرِاعانت: سالانہ 500 روپے پانچ سال: 2000 روپے تاحیات: 10,000 روپے

نام...پتہ...

....فون...

چیک اور منی آرڈر بنام تحریک اصلاح تعلیم ٹرسٹ A-97 نیلم بلاک، اقبال ٹاؤن، لاہور بھجوائیے

ٹرسٹ کو دیے جانے والے عطیات ٹیکس سے مستثنیٰ ہیں

تعلیم و تربیت

پروفیسر ملک محمد حسین

نصاب کی اسلامی تشکیل

بنیادی سوال

کن اقدارِ حیات کے تناظر میں، کن مقاصد تعلیم کی تکمیل کے لیے، کس قسم کا مواد تعلیم و تربیت، کس قسم کے ماحول میں، کون، کس ابلاغی حکمت عملی کے تحت طالب علم کو بہم پہنچاتا ہے اور اس کی اثر پذیری کس نظام امتحان اور معیار جائزہ کے تحت جانچی جاتی ہے۔

نصاب کیا ہے؟

محولہ بالا سوال کے جواب کی روشنی میں نصابِ تعلیم کے مندرجہ ذیل اجزا سامنے آتے ہیں۔ ① اقدارِ حیات ② مقاصد تعلیم ③ موادِ تعلیم و تربیت ④ درسی کتب ⑤ استاد ⑥ ابلاغی حکمت عملی ⑦ نظامِ جائزہ امتحان۔

اجزائے نصاب کی نوعیت:

اقدار حیات: ہمارے لیے اقدار حیات طے شدہ ہیں اور وہ ہیں اسلامی اقدار حیات۔

مقاصد تعلیم: ہماری تعلیم کا مقصد اولیٰ عقیدہ و عمل کے لحاظ سے مثالی مسلمان شخصیت کی تعمیر ہے۔ باقی مقاصد کی حیثیت ذیلی ہے۔

مواد تعلیم و تربیت: موجودہ صورتِ حال میں مواد تعلیم جن علمی ذخائر سے اخذ کیا گیا ہے ان کا اساسی اور تشکیلی فلسفہ مغربی فکر پر مبنی ہے۔ مغربی فکر پر اس وقت منطقی ثبوتیت کی حکمرانی ہے جو اصلاً انکار خدا کا علمبردار ہے۔ علمی ذخائر کو ان فلسفیانہ آلودگیوں سے پاک کرنا ضروری ہے۔

درسی کتب: درسی کتب کی تشکیل کون سی ثقافتی، نظریاتی اور فلسفیانہ بنیادوں پر کی گئی ہے؟ درسی کتب کی تشکیل مقامی ثقافتی اور اسلامی نظام حیات کے فلسفے پر مبنی ہونی چاہیے۔

تعلیمی ادارے کا سماجی ماحول: تعلیمی ادارے کا سماجی ماحول کن عادات واطوار، کن اقدار، کن رویوں اور جذبوں کی ترویج کرتا ہے؟ اسلامی نصاب کا تقاضا ہے کہ تعلیمی ادارے کا

سماجی ماحول اس طرح ڈھالا جائے کہ وہ اسلامی عادات واطوار، اسلامی اقدار حیات اور اسلامی رویوں اور جذبوں کی ترویج کرے۔

استاد: ماہرین تعلیم کہتے ہیں کہ استاد ہی اصل نصاب ہے۔ استاد جب کمرۂ جماعت میں داخل ہوتا ہے تو نصاب کے تمام مظاہر معدوم ہو جاتے ہیں اور استاد ہی نصاب کے تمام مظاہر کی مجسم صورت میں طالب علم کے سامنے ہوتا ہے۔ اس لیے عقیدہ وعمل کے لحاظ سے، عادات واطوار کے لحاظ سے شکل وصورت کے لحاظ سے اور رویوں اور جذبوں کے لحاظ سے استاد کا ایک مثالی مسلمان ہونا ضروری ہے۔ ورنہ نصاب کے باقی تمام اجزاء کو اسلامی قالب میں ڈھالنے کے باوجود محض استاد پر توجہ نہ دینے سے ساری مساعی اکارت ہو جاتی ہیں۔

ابلاغی حکمت عملی: ابلاغی حکمت عملی یا کلاس روم کا ڈیلیوری سسٹم اگرچہ استاد کی صورت میں مجسم نصاب کا حصہ ہے لیکن اس کا علیحدہ تذکرہ اس لیے ضروری ہے کہ اس مطلوبہ ڈیلیوری سسٹم میں موثر طریق ابلاغ میں جدید تحقیقات اور ٹیکنالوجی پر مبنی پُرتاثیر طریقوں کے استعمال کے ساتھ ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معلمانہ اسوۂ حسنہ سے استفادہ بھی ضروری ہے۔

نظامِ جائزہ وامتحان: نظام جائزہ وامتحان استاد کے بعد اور بعض اوقات استاد سے بھی بڑھ کر وہ اہم عامل ہے جو نصاب کی پوری صورت گری اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ اس کی واضح مثال ہماری موجودہ تعلیم وتدریس ہے جو مکمل طور پر Examination Oriented ہے۔ تعلیم وتربیت میں ہمیں حقیقتاً کیا مطلوب ہے اس کا اظہار امتحان کی نوعیت سے ہوتا ہے۔ اس لیے نظامِ جائزہ وامتحان کو اقدار حیات اور مقاصدِ تعلیم کا صحیح آئینہ دار ہونا چاہیے۔

تجاویز وسفارشات

بیان کردہ فکری ڈھانچہ کی روشنی میں مندرجہ ذیل اقدامات تجویز کیے جاتے ہیں:

۱۔ موجودہ ذخائر علم کو فکری آلودگیوں سے پاک کرنے کے لیے اور علم کی اسلامی تشکیل جدید کے لیے وسیع پیمانے پر تحقیق اور تدوینِ نو کی ضرورت ہے، جس کا سرکاری اور غیر سرکاری سطح پر اہتمام ہونا چاہیے۔

۲۔ پورے ملک میں واحد اور یکساں نصاب رائج ہونا چاہیے اور کسی بھی سرکاری، غیر

سرکاری یا مشنری ادارے کو اس سے استثناء نہیں ملنا چاہیے۔

۳۔ سول ٹیکسٹ بک (Sole Text Book) کی بجائے متبادل درسی کتب کی حوصلہ افزائی ہونی چاہیے لیکن ان کے استعمال کی منظوری اس مقصد کے لیے قومی سطح پر قائم کیا گیا ایک تعلیمی بورڈ دے جو ماہرین تعلیم اور علماء پر مشتمل ہو جو یہ دیکھے کہ آیا کتاب اسلامی اقدار حیات، متعین نصاب، اسلامی ثقافت اور طے کردہ مقاصد تعلیم کے عین مطابق ہے۔

۴۔ اسلامی نظریۂ حیات کی روشنی میں اساتذہ کے انتخاب کا ایک معروضی معیار طے کیا جائے۔ اس معیار کی روشنی میں منتخب کردہ افراد کی اقامتی، تربیتی اداروں میں پیشہ ورانہ تعلیم وتربیت کا اہتمام کیا جائے اور ان کی شخصیت مثالی مسلمان کی شکل میں ڈھالنے کی کوشش کی جائے۔ اساتذہ کے تربیتی نصاب میں قرآن وحدیث اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اسوۂ حسنہ کے معلمانہ پہلوکو زیادہ جگہ دی جائے۔

۵۔ تعلیمی اداروں کے سماجی ماحول کو اسلامی قالب میں ڈھالنے کے لیے اصول وضوابط تیار کیے جائیں اور انہیں قانون سازی کے ذریعے ایجوکیشن کوڈ کا حصہ بنایا جائے۔

۶۔ نصاب تعلیم برائے ابتدائی درجات میں قرآن وحدیث کا نسبتی حصہ بڑھایا جائے۔ نصاب اسلامیات اس طرح کا ہو کہ اس سے طالب علم کے سامنے اسلام کا ایک جامع اور متحرک تصور آئے۔

۷۔ پانچویں جماعت تک ناظرہ قرآن اور دسویں جماعت تک ترجمۂ قرآن کی تکمیل لازمی ہو۔

۸۔ سماجی علوم کے نصاب میں ابتدائی درجات میں صرف اسلامی تصورات پیش کیے جائیں جب کہ کالج اور یونیورسٹی کے نصاب میں اسلامی تصورات کے ساتھ عصری تصورات، تنقیدی وتجزیاتی تناظر میں پیش کیے جائیں۔

۹۔ ابتدائی درجات کے نصاب اور درسی کتب میں کوئی ایسا تصور شامل نہیں ہونا چاہیے جو اسلامی نظریۂ حیات کے منافی ہو۔

۱۰۔ قومی، اسلامی اور بین الاقوامی عصری ضرورتوں کے پیش نظر زبانوں کی تدریس کے لیے مندرجہ ذیل فارمولا استعمال کیا جائے:

i۔ پہلی دو جماعتیں صرف اُردو

ii۔ تیسری سے آٹھویں تک اُردو اور عربی

iii۔ نویں سے دسویں تک اُردو، عربی، انگریزی یا کوئی اور جدید غیر ملکی زبان

iv۔ گیارہویں تا بارہویں اُردو، انگریزی، یا کوئی اور جدید غیر ملکی زبان

v۔ بی۔اے/ بی ایس سی انگریزی یا کوئی اور جدید غیر ملکی زبان

۱۱۔ غیر ممالک میں لکھی گئی درسی کتب کے سکول کی سطح پر اندرون ملک استعمال پر مکمل پابندی ہو۔

۱۲۔ فرض عین کی سطح کا علم جو ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے اس کی تکمیل آٹھویں جماعت تک کر دی جائے۔

۱۳۔ میٹرک پاس کرنے والا ہر نوجوان کوئی نہ کوئی پیداواری مہارت ضرور سیکھے۔ پیداواری مہارتوں کی تدریس کا ایک وسیع تنوع نصاب کا حصہ ہونا چاہیے۔

۱۴۔ صحت کی تعلیم اور جسمانی و عسکری تربیت تعلیم کے تمام مرحلوں کے نصاب کا لازمی حصہ ہونا چاہیے۔

۱۵۔ اعلیٰ تعلیم کے نصاب میں تحقیقی سرگرمیوں کو زیادہ وزن دینے کی ضرورت ہے جس میں تحقیق کی اسلامی روایت کو زندہ کیا جائے۔

۱۶۔ نصاب تعلیم میں وسعت لانے کے لیے اور علم و تحقیق کی زیادہ مقدار طلبہ تک پہنچانے کے لیے ایام تدریس اور اوقات تدریس میں ممکن حد تک زیادہ سے زیادہ اضافہ کیا جائے۔

۱۷۔ تعلیم کی اسلامی تشکیل کے لیے قومی سطح پر منظور شدہ نکات پر مبنی ایک جامع ایجوکیشن ایکٹ پارلیمنٹ سے منظور کرایا جائے۔

تعلیم و تربیت

پروفیسر عطیہ محمد الابراشیؒ
مترجم: رئیس احمد جعفریؒ

فنِ تدریس

معلم کو کیا اور کیسا ہونا چاہیے؟

معلم کے ذمہ بہت بڑا کام ہوتا ہے اور وہ کام ہے علم اور سوسائٹی کی خدمت۔ اس اعتبار سے معلم کا درجہ سب سے اونچا اور بڑا ہے۔ خود سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علم کا اعتراف فرمایا ہے اور تعلیم کی طرف رغبت دی ہے۔

جرمنی کے مشہور مصلح مارٹن لوتھر (۱۴۸۳ ـ ۱۵۴۶ء) کا قول ہے: ’’اگر مجھے وعظ و ارشاد سے فرصت ملتی تو میں تعلیم کے سوا کوئی اور کام نہ کرتا۔‘‘

اس قول کی روشنی میں اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ مدرسہ ہی دراصل اصلاح وتعمیر کا سب سے بڑا مرکز ہے۔ یہ مدرس ہی کا کام ہے کہ وہ اپنی قوم کو ترقی یافتہ بنادے اور اسے ترقی یافتہ قوموں کے دوش بدوش کھڑا کردے۔

ارسمس کا قول ہے: ’’مجھے ایک مدرسہ سونپ دو، میں ساری دنیا کو منقلب کردینے کا عہد کرتا ہوں۔‘‘

معلم کا کام

معلم کا کام کیا ہے؟ وہ کیا کرتا ہے؟ وہ بچوں اور نوجوانوں کے افکار میں جلا پیدا کرتا ہے، ان کے شعور کو بیدار کرتا ہے، ان کی عقلوں کو زندگی بخشتا ہے، ان کے ادراک کو ترقی دیتا ہے۔ وہ انہیں باطل کے مقابلے میں حق کے ہتھیاروں سے مسلح کردیتا ہے۔ انہیں فضیلت کے ہتھیار دیتا ہے کہ وہ رذیلت کو ہلاک کردیں، انہیں علم دیتا ہے کہ وہ جہل کا خاتمہ کردیں اور وہ تھکی ماندی روحوں کو زندگی کا پیام دیتا ہے۔

سوئی ہوئی عقلوں کو جگا دیتا ہے۔ ضعیف شعور کو توانا کردیتا ہے۔ وہ ایک روشن مشعل ہاتھ

میں دے دیتا ہے کہ راستہ کی تاریکی دور ہو جائے اور مردہ زمین کو پھر سے سرسبز کر دیتا ہے، وہ لنڈ منڈ درخت کو بار آور کر دیتا ہے۔

تعلیم، رہبانیت کی ایک قسم ہے جس طرح ایک راہب دین کے لیے دنیا کو چھوڑ دیتا ہے اسی طرح ایک عالم، علم کے سوا، ساری دنیا سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ اگر آپ کسی ایسے راہب کو دیکھیں جو حبِ دنیا اور حُب جاہ کے مرض میں گرفتار ہو تو سمجھ لیجیے کہ وہ سچا اور پکا راہب نہیں ہے۔ اسی طرح اگر آپ کسی عالم کو سیم وزر کا بندہ دیکھیں تو یقین کر لیجیے کہ اس کا علم کھوٹا ہے۔ دنیا کی سب سے بڑی بدبختی یہ ہے کہ لوگ جن کاموں کے اہل نہیں ہوتے، وہی کرتے ہیں۔ یہ بہترین دستکار بن سکتا ہے لیکن وکالت کے پیچھے پڑا ہے۔ وہ بہترین وکیل بن سکتا ہے لیکن دستکاری میں الجھا ہوا ہے۔ بعض لوگ پیدا ہوتے ہیں روپیہ پیدا کرنے کے لیے لیکن پیشہ معلمی کا اختیار کر رکھا ہے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ دنیا میں ناکام رہتے ہیں۔ نہ اِدھر کے رہتے ہیں نہ اُدھر کے۔

لیکن معلمین کی کچھ شکایتیں بھی ہیں اور وہ بجا بھی ہیں۔ راہب کو ہماری سوسائٹی، اچھی غذا، اچھا لباس دیتی ہے اور معلم اس سے محروم ہے۔ راہب شادی نہیں کر سکتا، اپنی خانقاہ میں مگن رہتا ہے، اس پر کسی کا بوجھ نہیں ہوتا۔ معلم کو شادی کرنا پڑتی ہے، خانگی زندگی بسر کرنا ہوتی ہے، دوسروں کا بوجھ اٹھانا پڑتا ہے، لیکن اس کی اس مشکل کو آسان کرنے کی طرف توجہ نہیں دی جاتی۔

لوگوں کو اگر عقل سے دشمنی نہ ہوتی تو وہ معلم کو ہر ضرورتِ دنیاوی سے بے نیاز کر دیتے۔ اگر وہ اشیاء کی قدر و قیمت کا انداز رکھتے ہوتے، تو معلم کی قیمت سب سے زیادہ لگاتے۔

مدرس کی حیثیت

ہمیں مدرس کی حیثیت اور اہمیت پورے طور پر محسوس کرنی چاہیے تاکہ وہ اپنے اقوال وافعال اور حرکات وسکنات میں مدرسہ کے اندر اور باہر، کھیل کے میدان میں اور کلاس کے اندر، ایک بہترین اور قابل تقلید نمونہ طلبہ کے لیے بن سکے۔ اسے طریق تدریس سے آشنا ہونا چاہیے۔ بچوں کی نفسیات پر بھی عبور ہونا چاہیے، تاکہ ان کی صحیح تربیت کر سکے۔

شاگرد سے استادی تک

طالب علم کو مدرسہ کے اندر، تربیت گاہ کے اندر، ٹریننگ کالج میں، ہر جگہ اور ہمہ وقت طالب علم ہی رہنا چاہیے۔ بحث و درس اور تنقیب و اطلاع سے اسے پوری رغبت ہونی چاہیے، صرف اسی طرح وہ سچا اور مکمل مدرس بن سکتا ہے اور پھر اس کا شمار بہترین ماہرین تعلیمات میں ہوسکتا ہے۔

مدرس کی اصلاح

مدرسین کا ایک بہت بڑا طبقہ اصلاح کا محتاج ہے، ان کا اکثر وقت ضائع ہوجاتا ہے اور طلبہ ان سے ذرا بھی فائدہ نہیں اٹھا پاتے۔ مدرس کو چاہیے کہ وہ خود ہی اپنے سے حسب ذیل سوالات کرے:

۱۔ کیا وہ اپنی فرصت کے اوقات کا صحیح استعمال کرتا ہے؟

۲۔ کیا اس کی ذہنی و بدنی ریاضتوں کا کوئی نتیجہ نمودار ہوا؟

۳۔ کیا اس کے شاگردوں میں اس مقصد کی لگن پیدا ہوئی، جسے وہ پیدا کرنا چاہتا تھا؟

وہ مدرس ہرگز کامیاب نہیں ہوسکتا جس کی کوششیں ناکام ہوں اور جس کے عمل کا نتیجہ سامنے نہ ہو اور جس کے شاگرد اس سے پورے طور پر مستفید نہ ہوتے ہوں۔

مدرس کا فرض

تربیت جدیدہ کے اصولوں میں سب سے اہم اصول یہ ہے کہ معلم طلبہ کے کاموں میں از خود دخل نہ دے، بلکہ انہیں موقع دے کہ وہ خود اپنا کام کریں۔ معلم صرف اس وقت دخل دے، جب وہ خود مدد کے طالب ہوں۔

مدرس کا کام اور فرض یہ ہے کہ وہ طلبہ میں لگن پیدا کرے، انہیں تفکر مستقل اور عمل مستقل کا عادی بنائے۔ انہیں کثرت مطالعہ کی ترغیب دے، انہیں تلاش و تجسس کی لذت سے آشنا کرے، ان کی معلومات منظم کرے اور ان کے عمل کو پرکھے، ان کی نگہداشت کرے کہ وہ غلط

راستے پر نہ چل پڑیں۔ اور جب وہ حاجت مند ہوں تو ان کی مدد کرے۔

مدرس کو چاہیے کہ وہ ہر روز اپنے دل سے پوچھتا رہے:

۱۔ میں کس طرح پڑھا رہا ہوں؟

۲۔ طلبہ میں تعلیم کی لگن کس طرح پیدا کر سکتا ہوں؟

۳۔ اپنے رکھ رکھاؤ کے ساتھ کس طرح میں شاگردوں کو نشاط و رغبت کے ساتھ آمادۂ کار کر سکتا ہے۔

۴۔ اپنے شاگردوں کو وہ آزادی کس طرح دوں کہ مجھے مداخلت کی ضرورت نہ پڑے اور ان کے کام انہی پر چھوڑ دوں؟

مدرس کے واجبات

مدرس اگر اپنے پیشہ میں کامیاب ہونا چاہتا ہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ تربیت کے جدید اصولوں سے پوری طرح واقف ہو، جو یہ ہیں:

۱۔ مدرس کا عمل منظم اور مرتب ہونا چاہیے۔ اسے معلوم ہونا چاہیے کہ اسے آج کیا کرنا ہے؟ اس ہفتہ میں اسے کیا کرنا ہے؟ یہ موضوع کہاں سے شروع ہوتا ہے، کہاں ختم ہوتا ہے؟ وہ اپنے کام کو کس طرح تقسیم کرے کہ سال بھر کے اندر کورس بھی پورا ہو جائے اور طلبہ کو مراجعت اور اعادہ کا وقت بھی مل سکے؟

۲۔ مدرس کو چاہیے کہ درس اس طرح دے کہ ساری جماعت اسے اچھی طرح سمجھ لے۔ مدرس کا کام طلبہ کی رہنمائی ہے یہاں تک کہ وہ خود فکر و عمل کے استقلال پر قادر ہو جائیں۔

۳۔ اسباق کے مطابق فرد اور جماعت کے لیے کام متعین کرے اور دیکھے کہ عقل و استعداد کے مطابق ہر ایک کام کر رہا ہے یا نہیں؟ مدرس کو چاہیے کہ وہ اپنے طلبہ کے لیے معلومات کا منبع اور علم کا مصدر بن جائے۔ جو مدد کا طالب ہو، اس کا مددگار بن جائے۔ آپس میں تنازعات کا فیصلہ کامل عدل اور پوری غیر جانب داری کے ساتھ کرے۔ وہ ایسا سراپا محبت وشفقت باپ بن جائے جو اپنے بچوں کو ترقی یافتہ دیکھنا چاہتا ہے، ان کی منفعت کے بارے

میں ہر وقت سوچتا رہتا ہے۔ انہیں عمل کی ترغیب دیتا ہے۔

۴۔ مدرس کو اس نصیحت پر ہمیشہ عمل کرنا چاہیے کہ شاگردوں سے باتیں کم کرو، نگرانی زیادہ کرو۔ دیکھو ان کا کون سا پہلو مضبوط ہے اور کون سا کمزور۔ یاد رکھو کم کام، اگر وہ صحیح ہو، زیادہ کام سے بہتر ہے۔ مدرس کو یہ بھی ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے کہ تلامذہ نصیحت اور رہنمائی کے جو یا رہتے ہیں، یہ قطعاً مناسب نہیں کہ مدرس لکھ دے اور وہ نقل کر لیں، بغیر معنی اور مطلب سمجھے ہوئے۔ اس طرح انہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔

۵۔ طلبہ کو تفکیر کا عادی بنانا چاہیے۔ انہیں مناسب آزادی دینی چاہیے کہ وہ اپنا کام خود کر سکیں، اپنے آپ پر اعتماد کر سکیں، یہاں تک کہ پیش آمدہ تمام دشواریوں پر خود ہی غالب آ جائیں۔

۶۔ یہ بہت بڑی غلطی ہے کہ طلبہ کو ایک ساتھ بہت زیادہ آزادی دے دی جائے، آزادیٔ عمل رفتہ رفتہ دینی چاہیے، پوری اور کامل نگہداشت کے ساتھ۔

۷۔ تلامیذ کو اس کا خوگر بنانا چاہیے کہ وہ دوسروں کی طرف دیکھے بغیر اپنے اوپر اعتماد کر سکیں۔

بچوں کی نگرانی

بچوں اور شاگردوں کو اس طرح آزادی ملنی چاہیے کہ وہ یہ نہ محسوس کر سکیں کہ کوئی ان کے سر پر کھڑا ہے۔ وہ اطمینان و دل جمعی کے ساتھ اپنا کام کریں۔ اگر بچہ کو کام کی پوری فرصت نہ دی جائے اور اسے موقع نہ عطا کیا جائے، تو وہ صحیح طور پر اپنا مفوضہ کام نہیں انجام دے سکتا۔ یہ اعتماد علی النفس کا کام گھر اور باہر ہر جگہ ہونا چاہیے۔ ماں کو چاہیے کہ ہر وقت وہ بچہ پر پابندیاں نہ عائد کرے، کبھی کبھی اسے تنہا بھی جانے دے۔ جو ماں ہر وقت بچہ کو سینہ سے چمٹائے رہتی ہے وہ اس سے سچی محبت نہیں کرتی، بلکہ اسے غلام فطرت بنا دیتی ہے۔ وہ اس سے اعتمادِ نفس کی نعمت چھین لیتی ہے۔ وہ اسے موقع نہیں دیتی کہ وہ خود سے اٹھے، خود سے بیٹھے، خود سے زندگی کا مقابلہ کرے۔ ہر وقت اس پر مسلط رہتی ہے، اسے ذرا بھی آزادی نہیں دیتی، وہ اس کی زندگی اجیرن کر دیتی ہے اور اس مغالطہ میں مبتلا رہتی ہے کہ اس سے بہت زیادہ محبت کرتی ہے۔ علم

النفس اور تربیت کے بڑے بڑے ماہرین کا خیال ہے کہ مدرسین یا والدین کی طرف سے بچہ پر بہت زیادہ محبت کا اظہار، اس کے ساتھ دوستی نہیں، دشمنی ہے۔

ایک اچھے مدرس کا کام یہ ہے کہ وہ بچہ پر مسلط رہے، لیکن اسے محسوس نہ ہونے دے۔ اس کے اشاروں کو سمجھے، اس کی مرضی کو پہچانے، اس کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرے، لیکن کمزور بن کر نہیں۔ اس پر حکمرانی کرے، لیکن سختی کے ساتھ نہیں۔

آزادی

مدرس کو یاد رکھنا چاہیے کہ تربیت جدیدہ نے آزادیٔ عمل کی بہت بڑی گنجائش تلمیذ کے لیے رکھی ہے ۔ یہ آزادی بہت سوچ سمجھ کر دینی چاہیے۔ ایک لڑکے کے لیے جتنی آزادی مناسب ہے دوسرے کے لیے وہ قطعاً مضر ہے۔ وہ آزادی بھی کوئی قیمت نہیں رکھتی، جس میں ایک آدمی ہر کام میں دوسرے کی امداد واعانت کا محتاج اور جویا ہو۔ وہ آزادی بھی بے معنی ہے، جس میں میلان ورغبت پر پہرے لگے ہوں۔

بچہ کو آزادی اس طرح دینی چاہیے اور اس میں آزادی کے استعمال کا ملکہ اس طرح پیدا کرنا چاہیے کہ خود برائی اور اچھائی میں امتیاز کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔

مدرس کا عمل اور اثر

کوئی دانش مند بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کرسکتا کہ قوم اور سوسائٹی کی ترقی اور فروغ میں مدرس کا بڑا حصہ ہے۔ علمی، ادبی، خلقی، انفرادی، اجتماعی ہر اعتبار سے مدرس کا سب سے اہم کام اصلاح ہے۔ ان عیوب کی اصلاح، جو سوسائٹی میں بکھرے ہوئے ہیں اور فرد کو خراب کرتے رہتے ہیں۔ ہم مدرس سے صرف یہی توقع نہیں کرتے کہ وہ صرف درس پر اکتفا کرے گا، ہم تو اسے ایک ایسا اسوہ اور نمونہ دیکھنا چاہتے ہیں جس سے فائدہ اٹھایا جاسکے، جس کی تقلید کی جاسکے۔

مدرس کا کا اثر اپنے تلامذہ پر وہی ہوتا ہے جو باپ کا اپنی اولاد پر۔ ایک اچھا مدرس مدرسہ کے علاوہ سوسائٹی کی بھی اصلاح کرسکتا ہے۔ اسے چاہیے کہ وہ طلبہ کے لیے ایسا نمونہ بن

جائے جس کی وہ پیروی کریں۔ اسی کے نقش قدم پر چلیں، کردار و اعمال میں اسی کے اثر سے متاثر ہوں۔ معلم صرف نام ہی کا معلم نہیں ہوتا، وہ حقیقی معلم ہوتا ہے، اس کا اثر روح، ذہن اور دماغ سب پر ہوتا ہے۔ تعلیم سے بڑھ کر مقدس کوئی کام نہیں۔ معلم جیسے اونچے لقب کا مستحق وہی ہوسکتا ہے جو اہل ہو، جو مردِ کار ہو، جو پستی سے دور ہو، بلندی کا خوگر ہو۔

جیسا مدرس ویسا مدرسہ

''جیسا مدرس ویسا مدرسہ'' یہ کوئی غلط بات نہیں ہے، ایک حقیقت ہے۔ اس لیے کہ مدرس، طلبہ کے لیے نمونۂ کامل ہوتا ہے جس کی وہ پیروی کرتے ہیں۔ اس کے اخلاق و عادات، حرکات، سکنات، افکار و آراء، اقوال و افعال، سب کی تقلید وہ کرتے ہیں۔ پس اگر مدرس اچھا ہوگا تو مدرسہ میں بھی وہی فضا پیدا ہو جائے گی، ورنہ نہیں۔ یہ بالکل مدرس کے اختیار میں ہے کہ وہ اپنے طلبہ اور مدرسہ کو جس رنگ میں چاہے رنگ دے اور جیسا چاہے بنا دے۔

معلمی کی تیاری

تدریس کا کام کرتے ہوئے خاص صلاحیت کی ضرورت ہوتی ہے اس لیے کہ مدرس کی مشغولیت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ اس کا کام بہت بڑا ہوتا ہے۔ معلمی کا کام کرنے کے لیے صبر، برداشت اور تحمل کی بہت ضرورت ہوتی ہے۔ مدرس کو اخلاق کا پاکیزہ ہونا چاہیے، تعلیم سے اسے طبعی رغبت ہونا چاہیے، اسکول کے کورس سے اسے پوری واقفیت ہونی چاہیے۔

مدرس اور نصاب

مدرس کے لیے بہت ضروری ہے کہ وہ اپنے کورس سے واقف ہو، بلکہ یہ بھی ہے کہ سارے نصاب پر اس کی وسیع نظر ہو، تاکہ وہ اپنے علم اور طرزِ تعلیم سے طلبہ کے قلوب پر چھا سکے۔

سب سے پہلے مدرس کو مادہ تعلیم پر غور کرنا چاہیے، اگر وہ کورس پر قادر اور غالب ہے تو وہ آسانی کے ساتھ کامیاب ہوگا۔ اسے چاہیے کہ جو سبق بھی پڑھائے اس کی پہلے سے مکمل تیاری کر لے، اپنی فرصت کے اوقات حصول معلومات میں صَرف کرے۔ جو مدرس ان امور کا لحاظ نہیں کرتا، وہ کبھی کامیاب نہیں ہوسکتا۔ (بقیہ صفحہ نمبر: ۱۹)

تعلیم و تربیت مدیر

مسلم نوجوان اور شناخت کا بحران

[Muslim Youth in Search of Identity]

مسلم نوجوان شناخت کے بحران میں مبتلا ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے حکمران اور ہماری دینی قوتیں صحیح رُخ میں موثر جدوجہد کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکیں اور یہ کہ مسلمان امت زوال سے نکلنے کی جدوجہد میں کامیاب نہیں ہو پا رہی۔ سوال یہ ہے کہ اس صورتِ حال کا سبب کیا ہے اور اس کا علاج کیا ہے؟

ہماری رائے میں اس طرح کے بڑے اور گھمبیر مسائل کا دولفظی سادہ جواب ممکن نہیں ہوتا اور ان کے متعدد اسباب ہوتے ہیں۔ ہماری نظر میں اس کے دو بڑے فکری سبب ہیں۔ **ایک** یہ کہ ہم مغرب اور اس کی الحادی فکر وتہذیب کو ردّ کرنے کا واضح موقف نہیں اپنا سکے حالانکہ اس فکر وتہذیب کا اسلام کا نقیض ہونا اور اس کے علمبردار ممالک کا اسلام اور مسلم دشمن ہونا اظہر من الشّمس تھا اور ہے اور مسلمان اس کا خوب تجربہ کر چکے ہیں۔ **دوسرے** یہ کہ پہلی جنگ عظیم کے بعد مسلم نشأۃ ثانیہ کی تحریکوں کا آغاز کرتے وقت اور جنگ عظیم دوم کے بعد جب مسلم ممالک مغربی استعمار سے آزاد ہونا شروع ہوئے تو اپنے اجتماعی اداروں کی تشکیلِ نو کے وقت ہم انڈی پنڈنٹ اور اجتہادی نقطۂ نظر نہ اپنا سکے اور اس تقلیدی رویے سے چھٹکارا نہ پا سکے جو ہمارے زوال کا سبب بنا تھا اور نہ مغربی فکر وتہذب سے مرعوبیت اور اس کے ردّعمل کا شکار ہونے سے بچ سکے۔ اور مغربی فکر وتہذیب سے مفاہمت اور استفادے کے منہج کو دو صدیوں کی خوئے غلامی نے اور استعمار کی پرامن سازشی روش نے دوبارہ ہمیں، آزادی کے نام پر، غلامی کا غلاف پہنا دیا۔

ان حالات میں نسلِ نو اور مسلمان نوجوان شناخت کے بحران میں مبتلا نہ ہوں تو تعجب کی بات ہے!

تعلیم و تربیت مدیر

مَیں نے زندگی سے کیا سیکھا

رزقِ حلال

مَیں نے بچپن میں گھر میں عسرت دیکھی۔ والد صاحب کو (اللہ انہیں جنت الفردوس عطا فرمائے) گھر میں اور باہر سب 'میاں جی' کہتے تھے۔ میاں جی نے جوانی میں وسطِ ہند میں کاروبار کیا لیکن کامیاب نہیں ہوئے۔ قیام پاکستان کے بعد گاؤں واپس آ کر کاشتکاری شروع کر دی۔ اس میں بھی مشقت زیادہ تھی اور حاصل کم کیونکہ وہ اکیلے تھے اور اپنی زمین کم تھی۔ میرے بڑے دونوں بھائیوں نے یکے بعد دیگرے 'تلاش حق' میں ملازمت اور دنیاداری چھوڑ دی اور درویشی اختیار کر لی۔ یوں وہ میاں جی کا دست و بازو نہ بن سکے اور وہ مالی تنگ دستی کا شکار ہو گئے۔

میاں جی کے سکول کے زمانے کے ایک دوست تھے جو گاؤں کے چودہری اور نمبردار کے بھائی تھے اور جنوبی پنجاب میں کہیں تحصیل دار تھے۔ خوش حال گھرانا تھا۔ کبھی کبھار گھر (موضع بوریانوالی، ضلع گجرات) واپس آتے۔ ایک دفعہ بعد مغرب وہ ہمارے گھر آئے۔ گرمیوں کا موسم تھا، صحن میں چارپائیاں بچھی تھیں، والد صاحب حقہ گڑ گڑا رہے تھے کہ تحصیل دار صاحب آئے اور گپ شپ ہونے لگی۔ کہنے لگے کہ محمد اسحٰق (میرے بڑے بھائی، اسلامیات کے پروفیسر، اللہ تعالیٰ انہیں صحت و عافیت سے نوازے) آج کل کیا کرتا ہے؟ میاں جی نے بتایا: ایف اے کر لیا ہے سکول میں پڑھانے جاتا ہے۔ تحصیل دار صاحب نے کہا: اس سے آپ کے مالی مسائل حل نہیں ہوں گے، ایسا کریں اسے میرے ساتھ بھجوا دیں، مَیں اسے نائب تھانیدار لگوا دیتا ہوں۔ والد صاحب نے کہا: اچھا سوچتے ہیں.... لیکن بھائی کو ان کے ساتھ نہیں بھجوایا۔

دو تین سال بعد تحصیل دار صاحب پھر آئے اور گھر میں عسرت دیکھ کر پریشان ہوئے۔ پوچھا: چھوٹا کیا کرتا ہے؟ (یعنی مجھ سے بڑے بھائی محمد یوسف) میاں جی نے کہا: میٹرک کر لیا

ہے، کھاریاں چھاؤنی میں مزدوری کرنے جاتا ہے۔ تحصیل دار صاحب کہنے لگے: اسے میرے ساتھ بھجوادیں، پٹواری لگوادوں گا اور آپ کے دلدّر دور ہو جائیں گے۔ میاں جی نے کہا: اچھا سوچتے ہیں.... لیکن بھائی کو ان کے ساتھ نہیں بھجوایا اور وہ محنت مزدوری کرتے رہے۔

یوں میاں جی کی زندگی کا ایک بڑا حصہ عسرت اور مالی پریشانیوں میں گزر گیا لیکن ان کا جی رزقِ حرام قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوا۔ پھر ہم چھوٹے بتدریج سیٹل ہو گئے، کچھ سعودی عرب چلے گئے اور یوں گھر کے معاشی حالات بہتر ہو گئے اور میاں جی نے آخری زندگی آرام اور راحت سے گزاری۔ فالحمدللہ علیٰ ذلك.

بقیہ: فنِّ تدریس

عمل کی محبت

مدرس اگر چاہے تو وہ اپنے طلبہ کے اندر علم، مدرسہ اور عمل کی محبت پیدا کرسکتا ہے۔ اپنے اسباق ذہنی اور عملی طور پر ان کے رگ و پے میں جاری وساری کرسکتا ہے۔ لڑکوں میں علم کا شوق پیدا کرسکتا ہے تا کہ جب تک درس ختم نہ ہو جائے، ان کا اٹھنے کو جی نہ چاہے۔ تلامذہ میں تشویق پیدا کرنے کی صورت یہ ہے کہ درس اور نصاب مختصر ہو، زیادہ طویل نہ ہو اور درس میں ہاتھ سے کرنے والے کام بھی شامل ہوں۔

حفظِ نظام

جو مدرس اپنے شاگردوں کو ضبط و نظام کا خوگر نہ بنا سکے اور بغیر کسی مار دھاڑ، ڈانٹ ڈپٹ کے محض اپنی شخصیت کے اثر سے انہیں راہِ راست پر نہ لا سکے، وہ اس قابل نہیں کہ اسے مدرس کہا جائے۔ وہ اس کا اہل نہیں کہ مدرس بنایا جائے۔

مدرس پر اعتماد

طلبہ کو مدرس پر اتنا ہی اعتماد ہونا چاہیے جتنا فوج کو کمانڈر پر ہوتا ہے۔ اگر فوج اپنے جرنیل پر اعتماد نہ کرے تو شکست، بغاوت، یا فرار یقینی ہے۔ اسی طرح اگر طلبہ اپنے معلم پر اعتماد نہ کرتے ہوں، تو نہ وہ کامیاب ہو سکتے ہیں نہ معلم۔

تعلیم و تربیت

ڈاکٹر حافظ محمد زبیر [۱]

دینی مدارس کے طلبہ ۔ مستقبل کیا ہے؟

مدارس اپنے طلبہ کی فکری استعداد بڑھانے کے لیے کچھ نہیں کر رہے

دینی مدارس میں داخلے کے محرکات، مقاصد اور نتائج ایک قابل غور موضوع ہے۔ دینی مدارس میں آنے کی ایک بڑی وجہ والدین کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ ان کا کوئی بچہ حافظ قرآن یا عالمِ دین بن جائے۔ ایسے طالب علم مدرسہ پر بوجھ بن جاتے ہیں الّا یہ کہ ان میں سے بعض میں از خود ہی شوق کی آگ بھڑک اٹھے اور وہ اللہ کی دین ہے جسے وہ چاہے دے۔ دوسری بڑی وجہ کسی دینی تنظیم یا تحریک کی ترغیب ہوتی ہے جیسا کہ تبلیغی جماعت یا جماعۃ الدعوۃ کے ساتھ لگے تو دین کی تعلیم کا شوق پیدا ہو گیا۔ ایسے طلبہ عموماً شوق سے مدرسہ جوائن کرتے ہیں اور محنتی ہوتے ہیں۔ تیسری بڑی وجہ غربت ہے کہ اسکول کی تعلیم بہت مہنگی ہے اور کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر ہے لہٰذا دینی مدرسہ جوائن کر لیا۔

چوتھی بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ اب کئی دینی مدارس میں دنیاوی تعلیم بھی ہے تو اس وجہ سے بھی کچھ بچے مدرسہ جوائن کرتے ہیں کہ دین کے ساتھ دنیا کی تعلیم بھی حاصل کر لیں تا کہ اچھے روزگار کے مواقع پیدا ہو جائیں۔ اگر ایسے طلبہ معاشرے میں جا کر دین کا کام کریں نہ کہ اس کے رنگ میں رنگے جائیں تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں۔ پانچویں وجہ یہ بھی ہے کہ کچھ لوگ کسی بڑے عالم دین یا سلیبریٹی کو دیکھتے ہیں جیسا کہ مولانا طارق جمیل وغیرہ تو ان جیسا بننا چاہتے ہیں تو مدرسہ جوائن کر لیتے ہیں۔ ان طلبہ میں مقصدیت ہوتی ہے لیکن صرف اپنی ذات کی حد تک۔ اگر اس مقصدیت کا رخ امت کی طرف موڑ دیا جائے تو شاید یہ طلبہ بہت کام کر سکتے ہیں۔ چھٹا محرک یہ بھی ہے کہ علماء کے گھرانے سے تعلق ہے لہٰذا عالم دین بننا ایک رسمی بات ہے یا مجبوری ہے کہ آگے چل کر مدرسہ سنبھالنا ہے یا علمی وراثت جاری رکھنی ہے۔ اس کے علاوہ بھی محرکات ہیں لیکن بڑے یہی ہیں۔

رہا دینی مدارس میں داخلے کے وقت داخلہ ٹیسٹ رکھنا تو یہ نہیں رکھا جا سکتا۔ اس کی وجہ

---

[۱] کامسیٹ یونیورسٹی، لاہور

یہ ہے کہ دینی مدارس جس اسٹرکچر پر چل رہے ہیں، یہ اس کا لازمی تقاضا ہے کہ زیادہ سے زیادہ بچوں کو داخلہ دیا جائے۔ دینی مدارس بنیادی طور صدقہ خیرات پر چلتے ہیں اور خیرات (ڈونیشن) کام کے حساب سے ملتی ہے اور کام کو سوسائٹی ہمیشہ مادی معیارات سے ماپتی ہے۔ اور کام کو ماپنے کا مادی معیار جو بھی مقرر کر لیا جائے، اس میں طلبہ کی تعداد ایک بنیادی محرک کا کردار ادا کرے گی۔ تو زیادہ ڈونیشن کے لیے لازم ہے کہ آپ زیادہ کارکردگی ظاہر کریں۔ اور زیادہ کارکردگی آپ طلبہ کی زیادہ تعداد کو داخلہ دیے بغیر دکھا نہیں سکتے۔ اتنے طلبہ پڑھ رہے ہیں! بہت بڑا مدرسہ ہے! یہاں ڈونیشن دینی چاہیے، یہ پوری سائنس ہے۔

مقصدیت کے فقدان کی وجہ محرکات کا مسئلہ ہے۔ جب محرکات ہی درست نہ ہوں تو مقصدیت کیسے پیدا ہوگی؟ اور نتائج کے بارے میں اگر ہم نے کچھ کہا تو بے وقت کی راگنی ہو گی۔ صرف اتنا کہہ سکتے ہیں کہ کبھی آپ مدارس کے بچے تیار کر کے غامدی صاحب کے حوالے کر دیتے ہیں اور کبھی طالبان کے۔ اور اب "مدرسہ ڈسکورس" (عمار خان ناصر اور مستشرقین کے مشترکہ پروجیکٹ) والوں کے حوالے کر رہے ہیں۔ اور یہی ہوتا رہے گا جب تک "فکر" اور "فکری مسائل" کو مرکزی مضمون (core subject) کے طور پر دینی مدارس کے نصاب میں شامل نہیں کیا جائے گا۔ المیہ یہ ہے کہ جہاں کچھ فکر موجود ہے جس سے دینی مدارس کے طلبہ کی فکری بنیادیں مضبوط ہوسکتی ہیں اور وہ اعتزال یا خوارجیت کی انتہاؤں کی بجائے معتدل اسلامی فکر کے دائرے میں رہتے ہوئے دین کی کوئی خدمت سرانجام دے سکتے ہیں، اس فکر اور مفکر دونوں کو گالیاں دے کر اس کے سایے سے بھی اپنے بچوں کو بچانے کی کوشش کی جاتی ہے مثلاً مولانا مودودی وغیرہ۔ اور اپنے پاس فکر نام کی کوئی چیز ہے ہی نہیں اور نہ ہی فکری ذوق موجود ہے تو نتیجہ کیا نکلے گا؟ وہی جو نکل رہا ہے۔ محنت کر کے آٹھ سال بچے آپ تیار کریں گے اور پھل وہ کھائیں گے جن سے آپ کو شدید فکری اختلافات ہیں۔ ہم نے دینی مدارس کے طلبہ کے لیے "اسلامی نظریۂ حیات" کے نام سے ایک فکری نصاب مرتب کیا تھا، اس کو دو دن کی ویڈیو ورکشاپ میں ریکارڈ بھی کروایا تاکہ مدارس کے بچوں کی فکری بنیادیں مضبوط ہوں اور کسی فکری فتنے سے محفوظ رہیں کیونکہ ان کی ساری تربیت فقہی فتنوں سے حفاظت کے تناظر میں کی جاتی ہے لہٰذا جہاں ان کی تربیت ہی نہیں ہوئی تو اس گوشے میں وہ فتنہ سے کیسے محفوظ رہ پائیں گے؟

ہم نے حنفی اور سلفی دونوں روایتوں کو جمع کر کے ایک نصاب ترتیب دینے کی کوشش کی تھی کہ اپنی روایت سے جڑے رہتے ہوئے کیسے وہ نہ صرف معاصر فکری فتنوں سے محفوظ رہ سکتے ہیں بلکہ اپنے اندر ایک روایتی خوداعتمادی بھی حاصل کر سکتے ہیں لیکن ابھی اس امت کو یہ سمجھانا بھی قبل از وقت ہے کہ اس کی کوئی ضرورت بھی ہے یا نہیں؟ یہ تو جب ڈونیشن دینے والے متوجہ کریں گے کہ ہم اس لیے تو ڈونیشن نہیں دے رہے کہ آپ کے بچے مدارس سے نکل کر یہ بنیں تو پھر یہ حضرات شاید ایسا کوئی فکری نصاب بنانے کی کوشش کریں۔ اور اس وقت شاید کسی کے سامنے وہ کتابچہ بھی آجائے تو انہیں اس کی اہمیت کا احساس ہو۔ اور وہ نہ سہی لیکن اس کی ترتیب پر ہی کوئی نصاب تشکیل دے لیں۔ اور کسی دوسرے کو نہ سہی، خود کو ہی اپنا فکری امام بنالیں۔ ہماری رائے میں اس کام میں ابھی آرام سے بیس تیس سال لگ جائیں گے۔ اور عین ممکن ہے کہ ہم اس وقت دنیا میں نہیں ہوں گے لیکن لوگ دعائیں دیں گے اور کچھ زیادہ جذباتی علامہ اور مولانا کے سابقے لاحقے بھی لگا دیں گے کہ دیکھیں حضرت نے بیس سال پہلے ایک ضرورت کا احساس کر لیا اور بڑا کام کر دیا لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ کام قبل از وقت نہیں تھا، یہ لوگ زمانے سے بیس سال پیچھے تھے۔

ہم یہ بھی سوچ رہے ہیں کہ اس کتاب کو سبقاً سبقاً ایک کورس کی صورت میں ویڈیو ریکارڈنگ کروا دیں کہ اسے سمجھنا آسان نہیں ہے بلکہ مشکل ہے، اس کی وجہ صلاحیت اور ذہانت کی کمی نہیں بلکہ فکری ذوق کا نہ ہونا ہے۔ فکری ذوق کی بیداری، تشکیل اور نشوونما ضروری ہے لیکن دینی مدارس کے علمی اسلوب میں۔ اور سب سے اہم یہ کہ دینی مدارس کے کچھ باصلاحیت لوگوں کو اب ادارے بنانے کی بجائے علمی کام کرنے کو اپنا مقصد زندگی بنانا چاہیے۔ ہم نے اپنا اچھا بھلا ٹیلنٹ ادارے بنانے میں ضائع کر دیا۔ جس کو اللہ عزوجل کچھ صلاحیتوں سے نوازتے ہیں، وہ ایک نیا ادارہ بنانے چل پڑتا ہے اور پھر اس کے انتظامی اور مالی وسائل کو پورا کرنے میں اپنا علمی کیریئر تباہ کر دیتا ہے۔ تو جب سب باصلاحیت لوگ ادارے بنانے اور چلانے میں لگے ہوں گے تو فکری کام کون کرے گا؟ اس لیے ہمیں یہ طے کر لینا چاہیے کہ ہمیں کوئی ادارہ نہیں بنانا ہے تو تبھی ہم دین کی کوئی قابل قدر علمی خدمت سرانجام دے سکیں گے، یہ ہر اچھے اور باصلاحیت عالم دین کی سوچ ہونی چاہیے۔

تعلیم و تربیت
پروفیسر ملک محمد حسین

پاکستان اور یکساں نصابِ تعلیم

جس کا رُخ بعض قوتیں سیکولرزم اور لبرل ازم کی طرف موڑنا چاہتی ہیں جبکہ اسلامی نظریۂ حیات کو پاکستانی نصاب تعلیم کی نبیاد نہ بنا کر ہم اپنی تباہی کا سامان کریں گے

قوم بنتی ہے اُن افراد سے جن کی سوچ اور فکر کے دھارے متماثل ہوں، جن کی دلچسپیاں اور رجحانات مشترک ہوں، جن کے رویے اور اُمنگیں ایک ہوں اور سب سے بڑھ کر جن کا عقیدہ، جن کا قبلہ اور جن کی عبادات کا نظریہ ایک ہو۔ کھانے پینے، اُٹھنے بیٹھنے اور میل جو کے قرینے، گھر، خاندان اور معاشرے کے رسوم ورواج، خوشی، غمی اور اُس کے مظاہر، امانت دیانت اور خیر وشر کی اقدار، محبت، نفرت اور بین الاقوامی تعلقات کی بنیادیں، یہ سب مرہونِ منت ہیں اس بنیادی نظریۂ حیات کے جو قوم کے تمام افراد کے ذہنوں میں اس طرح جاری وساری ہوتا ہے جیسے خون جانداروں کے رگ وریشے میں۔

کوئی قوم، قوم نہیں بن سکتی اور کوئی قوم، قوم نہیں رہ سکتی جب تک وہ اپنے اساسی نظریۂ حیات، اپنی سوچ اور فکر کے متماثل دھاروں، اپنی مشترک دلچسپیوں اور رجحانات اور اپنی امنگوں اور رویوں کی متفق علیہ بنیادوں کی حفاظت، آبیاری اور نئی نسل کی طرف منتقل کرنے کا اہتمام نہیں کرتی۔

اسلام ایک آفاقی نظریہ ہے اور اسلامی نظریۂ حیات اپنے ماننے والوں سے نہ صرف ملت کے اندر اس نظریہ کے تسلسل کا تقاضا کرتا ہے بلکہ اُن افراد اور اقوام تک پہنچانے کا تقاضا بھی کرتا ہے جو ابھی تک اس کی برکتوں سے فیض یاب نہیں ہوئے۔ نظریۂ حیات کے تسلسل اور توسیع کا ذریعۂ تعلیم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر ملک اور ہر قوم اپنے نظریۂ حیات کی ترویج وتوسیع اور ترسیل وترفیع کے لیے تعلیم کو وسیلہ بناتی ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی تعلیم، معیشت اور پیداواری صلاحیتوں میں ترقی قوم کے نظریۂ حیات کی ترسیل وترفیع میں قوت اور معاونت مہیا کرتے ہیں، کمزوری اور مخاصمت کا باعث نہیں ہوتے۔

وہ قومیں جو من حیث القوم ترقی، استحکام، یکجہتی اور خوش حالی سے ہم کنار ہیں ان کا نظام تعلیم

اس بات کا ضامن ہے کہ ان کی ترقی ، استحکام، یکجہتی اور خوش حالی نہ صرف قائم رہے بلکہ ان کی قوت اور اثر ورسوخ میں اضافہ بھی ہوتا رہے۔عصر حاضر کی مادی طور پر ترقی یافتہ اور طاقتور اقوام کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔امریکہ، برطانیہ،فرانس، جرمنی، جاپان اور اب چین ایسے ممالک ہیں جو اپنے نظریۂ حیات سے کامل اخلاص کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں اور اپنی تمام سماجی ، معاشی ، خارجی ، داخلی اور سب سے بڑھ کر تعلیمی پالیسیوں کو اپنے نظریۂ حیات کے فریم ورک میں تشکیل دیتے ہیں۔ جنگ عظیم دوم کے بعد جرمنی اور جاپان کی تعمیرِ نو اور حیرت انگیز ترقی اور قوموں کی برادری میں ان کی سربلندی براہِ راست نتیجہ ہے ان تعلیمی پالیسیوں اور اقدامات کا جو انہوں نے ماضی کے تاریخی تجربات کی روشنی میں اپنے حال اور مستقبل کو سنوارنے کے لیے کیے۔ برطانیہ، فرانس، جرمنی، جاپان، امریکہ اور کوریا اپنے تمام تر سیکولر نعروں کے باوجود کوئی کم مذہبی نہیں ہیں لیکن اسرائیل اور بھارت کی مثالیں مذہبی بنیاد پرستی اور اس پر مبنی قومی پالیسیوں کے حوالے سے کلاسیکل درجہ رکھتی ہیں۔قومی تفاخر اور ماضی سے ولولہ حاصل کرنے کے لیے تاریخ کو مسخ کرنے اور اس مسخ شدہ تاریخ سے من مانے نتائج اخذ کر کے نئی نسل کو اپنی محدود قومیت پر راسخ کرنے کا تعلیمی وتربیتی عمل ان دو ممالک میں ایسے نتائج پیدا کر رہا ہے جس کے مظاہرہ دنیا ہر روز دیکھتی ہے۔

موجودہ عالمی نظام یک قطبی ہونے کے باوجود قومی ریاستوں کا نظام ہے جس میں ہر قومی ریاست اپنی بقا کے لیے نئی نسل کو تعلیم و تعلم کے ذریعے جو معلومات ، اقدار، جذبے، رویے اور دلچسپیاں منتقل کرتی ہے وہ اُس قومی ریاست کے نظریۂ حیات کا مخصوص رنگ لیے ہوتے ہیں۔ جدید دور کی قومی ریاستوں میں امریکہ کی قومی ریاست تعصب ، تنگ نظری اور خود غرضی کا ایک عجیب رنگ لیے ہوئے ہے کہ جس کے سامنے مستقبل کے موہوم اور خود ساختہ خطرات کے پیش نظر حفظ ما تقدم کے طور پر کسی ملک قوم اور گروہ کا تورابورا کر دینا اس کی قومی پالیسی ہے۔

قومی ریاستوں کے حوالے سے جو کچھ کہا گیا ہے وہ سب کچھ ہماری نظر میں لازماً پسندیدہ نہیں ہے۔ہم نے تو صرف قومی ریاستوں کے تناظر میں صورتِ حال بیان کی ہے۔موجودہ یک قطبی دنیا میں امریکہ اپنی سرداری میں عالمی حکومت کے خواب دیکھتا رہا ہے جسے روبہ عمل لانے کے لیے ڈبلیوٹی او (WTO) کے ہتھیار کے ساتھ ساتھ گلوبل ایجوکیشن ،گلوبل نصاب اور گلوبل اقدار کی بات آگے بڑھائی جارہی ہے۔ یہاں گلوبل نصاب، گلوبل تعلیم اور گلوبل اقدار کا

مطلب ہے امریکہ کا پسندیدہ نصاب تعلیم، امریکہ کا پسندیدہ نظام تعلیم اور امریکہ کی پسندیدہ اقدار اور رویے۔ امریکہ کے گلوبل عزائم کے راستے میں قابل توجہ بلکہ سب سے بڑی رکاوٹ اسلام اور اس کے ماننے والوں کا نظامِ حیات ہے جو درحقیقت واحد نظام حیات ہے جس میں گلوبل نظام حیات بننے کی قوت اور صلاحیت ودیعت کی گئی ہے کیونکہ کائنات کے خالق نے یہ نظام حیات پوری کائنات میں جاری وساری اور غالب وحاوی کرنے کے لیے نازل فرمایا۔ مسلمان ممالک اور مسلمان معاشرے اپنی تمام تر خامیوں اور کمزوریوں کے باوجود گلوبل نظام حیات سے ہی اپنی سوچ اور فکر، اپنی دلچسپیاں اور رجحانات، اپنے رویے اور اُمنگیں اور سب سے بڑھ کر اپنا عقیدہ اور اقدار حاصل کرتے ہیں۔ ظاہر ہے یہ سب کچھ ترک کرکے وہ اپنا ملی وجود اور معاشرتی ڈھانچہ قائم نہیں رکھ سکتے۔

پاکستان جس کا معرض وجود میں آنا ہی اس گلوبل نظامِ حیات یعنی اسلام کا مرہونِ منت ہے وہ کس طرح اپنے نظریۂ حیات سے صَرفِ نظر کرسکتا ہے، خاص طور پر اس صورت میں جب اسلام کا گلوبل نظام حیات اپنے نہ ماننے والوں کو بھی وہی معاشرتی، معاشی اور قانونی حقوق اور تحفظ دیتا ہے جو وہ اپنے ماننے والوں کو دیتا ہے۔ یہ کتنی ناانصافی ہوگی کہ اس سراپا رحمت پرور نظامِ حیات کے علم اور اس کی برکتوں سے انہیں محروم رکھا جائے جو صرف اس لیے اس کے پیروکار نہیں ہیں کہ وہ جانتے نہیں ہیں ورنہ اگر وہ اسے جان لیں اور پہچان لیں تو اس طرح لپک کر اس کی طرف آئیں جس طرح بچھڑا ہوا بچہ ماں کی گود میں پناہ لینے کے لیے بے تابی سے دوڑتا ہے۔

سطورِ بالا میں بیان کردہ نکات اور خیالات اس بات کا تقاضا کرتے ہیں کہ پاکستان کے قومی نصاب تعلیم میں اسلامی نظریۂ حیات اس طرح سرایت کیے ہوئے ہو جس طرح انسانی جسم میں خون لانے لے جانے کے لیے وریدوں اور شریانوں کا نظام ہوتا ہے۔ سیاسیات کی جدید اصطلاح میں پاکستان مسلمانوں کی قومی ریاست ہے اور مسلمانوں کی قومی ریاست ہونے کے ناطے یہ عالمی اسلامی ریاست کا نقطہ آغاز بھی ہے۔ اس حوالے سے اگر دیکھا جائے تو اس کے بچوں کو پڑھائی جانے والی تاریخ اور اُن کے اذہان میں اُتارے جانے والے جغرافیائی تصورات عالمگیر نوعیت کے ہونے چاہئیں۔ ہم پاکستان کے قومی نصابات اور درسی کتب کے ناقدین (جو غیر ملکی ایجنسیوں کی کثیر رقوم سے بہرہ ور ہو کر اُوٹ پٹانگ سطحی، غیر علمی

اور متعصّبانہ رپورٹس کو پھیلا رہے ہیں) کی اس بات سے متفق ہیں کہ پاکستان کے بچوں کو محدود تاریخ اور محدود جغرافیہ نہیں پڑھانا چاہیے لیکن ہم ان کی اس بات سے اتفاق نہیں کر سکتے کہ بعض اقوام جن میں بھارت اور اسرائیل شامل ہیں اور بعض گروہ جن میں ہندو، عیسائی اور یہودی شامل ہیں ان کو ان زیادتیوں سے بری کرنے کے لیے تاریخی حقائق مسخ کریں اور اپنی آئندہ نسلوں کو غلط معلومات بہم پہنچا کر خواب غفلت اور گمراہی میں مبتلا کریں۔

اسلام ہمارے سب اعمال وافعال اور کمال وجمال کی بنیاد ہے۔ اس کے بغیر تو تعلیم کا کوئی تصور بنتا ہی نہیں۔ مکمل تعلیم کے لیے مکمل اسلام ضروری ہے اور مکمل اسلام جہاد اور شہادت کے بغیر کیسے مکمل کہا جا سکتا ہے کیونکہ بقول شاعر ؎ اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد اور کربلا سمبل ہے جہاد اور شہادت کا۔

فیوچر یوتھ گروپ کے نوجوان لبرلز اور ایس ڈی پی آئی کے منجھے ہوئے بوڑھے دانشور اپنی لبرل دانشوری کے سائے برطانیہ، امریکہ، اسرائیل اور بھارت تک پھیلا کر تو دیکھیں، انہیں اپنے ان ممدوح ممالک کی ترقی پسندی، وسعت قلبی اور نظریاتی آزادی کا پتہ چل جائے گا۔ ہم وفاقی وزیر تعلیم اور ان کے مشیروں کی اس بات کی تائید کرتے ہیں کہ پاکستان کے قومی نصاب اور درسی کتب پر نظر ثانی کی ضرورت ہے لیکن اس سمت میں نہیں جس سمت کی طرف فیوچر یوتھ گروپ، پائیدار ترقی کا پالیسی انسٹیٹیوٹ (SDPI) اور بروکنگز انسٹی ٹیوٹ کا تھنک ٹینک انہیں لے جا رہا ہے بلکہ اس سمت میں جس کی طرف بابائے قوم نے ۱۹۴۷ء کی پہلی تعلیمی کانفرنس میں رہنمائی کی تھی اور جس کا خاکہ علامہ اقبال نے اپنے نثری اور شعری مجموعوں میں تفصیل کے ساتھ پیش کیا ہے۔ موجودہ حکومت پورے ملک میں یکساں نصابِ تعلیم رائج کرنے کی دعویدار ہے ہم ان سے اپنے دعوے کی تکمیل کا مطالبہ کرتے ہیں لیکن دکھائی یہ دیتا ہے کہ لبرلزم اور سیکولرزم اس حکومت کے فیصلہ سازوں پر کچھ زیادہ ہی سوار ہے نیز چونکہ حکومت کے کارپردازوں میں تعلیمی سوچ اور وژن کا فقدان ہے اس لیے بعض این جی اوز جو بیرونی فنڈنگ سے تمتع حاصل کرتی ہیں وہ حکومت کی تعلیمی سرپرست بنتی جا رہی ہیں۔ اثر (ASER) اور اے ٹی آئی جیسی مقامی اور بین الاقوامی تنظیمیں اپنے سروے اور نام نہاد ریسرچ کے اثرات کو استعمال کرتے ہوئے حکومت کے فیصلوں پر اثر انداز ہونے کی کوشش کر رہی ہیں۔ ہم تحریک انصاف کی حکومت کو توجہ دلاتے ہیں کہ اسلام کے آفاقی نظریہ سے ہٹ کر یکساں نصاب کی تشکیل ملک وقوم کے لیے زہر قاتل ہوگی۔

تزکیۂ نفس

مولانا مفتی تنظیم عالم قاسمی [۱]

دل پر معصیت کے اثرات اور اس کے نتائج

قرآن حکیم کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی معصیت سے انسانی دل پر تین طرح کے اثرات پڑتے ہیں اور ان اثرات کے نہایت مہلک نتائج نکلتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی معصیت اور گناہوں پر دلیری سے پہلا اثر یہ پڑتا ہے کہ دل پر زنگ چڑھ جاتا ہے۔ دوسرا یہ کہ دل سخت ہوجاتا ہے اور تیسرا یہ کہ دل پر مہر لگ جاتی ہے۔ اب ہم دیکھیں گے کہ ان تین اصطلاحات کا کیا مطلب ہے اور ان کا انسان شخصیت پر کیا اثر پڑتا ہے؟

دل پر زنگ چڑھ جانا

دلوں پر اچھی بات اثر انداز نہ ہونے کی وجہ بیان کرتے ہوئے قرآن حکیم نے فرمایا:
كَلَّا بَلْ ۜ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿14﴾ [المطففین ۸۳: ۱۴] ''ہرگز نہیں بلکہ دراصل ان لوگوں کے دلوں پر ان کے برے اعمال کا زنگ چڑھ گیا ہے۔''

گناہوں کی کثرت ومزاولت سے دل پر تاریکی چھا جاتی ہے، پھر جوں جوں گناہ کا سلسلہ جاری رہتا ہے، تاریکی میں شدت پیدا ہوتی رہتی ہے اور یہ حالت اس قدر پختہ ہوجاتی ہے کہ روشن دلائل اور قرآن وحدیث کی باتوں اور نیک خیالات کا اس پر گزر نہیں ہوتا۔

حضرت ابوہریرہؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک موقع پر ارشاد فرمایا:
[illegible]
صُقِلَ قَلْبُهُ، وَإِنْ زَادَ زَادَتْ، حَتَّى يَعْلُوَ قَلْبَهُ ذَاكَ الرَّانُ الَّذِي ذَكَرَ اللهُ عَزَّ وَجَلَّ فِي الْقُرْآنِ: ﴿كَلَّا بَلْ ۜ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ﴾ [مسند احمد: ۷۹۳۹]
انسان جب کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے قلب پر ایک سیاہ نقطہ لگ جاتا ہے۔ اگر اس نے توبہ واستغفار کرلیا تو یہ سیاہی مٹ جاتی ہے اور دل صاف ہوجاتا ہے، لیکن اگر اس نے اس گناہ سے توبہ نہ کی اور دوسرا گناہ کرلیا تو ایک دوسرا سیاہ نقطہ لگ جاتا ہے اور اسی طرح ہر گناہ پر

[۱] دارالعلوم سبیل السلام، حیدرآباد (بھارت)۔ تلخیص: ادارہ

سیاہ نقطہ لگتے چلے جاتے ہیں، یہاں تک کہ یہ سیاہی سارے قلب پر محیط ہوجاتی ہے، اسی ظلمت وسیاہی کا نام قرآن کریم میں ’’ران‘‘ آیا ہے: [illegible]

كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ [المطففین ۸۳:۱۴]

اس مضمون پر مشتمل متعدد احادیث مذکور ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی سرکشی اور بداعمالیوں سے دل کی نورانیت ختم ہوجاتی ہے، پھر نصیحتوں اور نیک باتوں کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا، دل کی سیاہی ایک پر ایک گناہ سے بڑھتی ہی جاتی ہے۔ جب تک توبہ واستغفار کرکے اسے پاک صاف نہ کرلیا جائے، ہر کلام اس کے لیے غیر موثر ثابت ہوتا ہے، اس لیے ایک مسلمان کو چاہیے کہ اپنے دل کو گناہوں سے آلودہ نہ ہونے دے۔ اگر بشری تقاضے کی بنیاد پر کبھی گناہ سرزد ہو بھی جائے تو اللہ کی طرف رجوع ہو، آنکھوں سے آنسو بہا کر خدا کے حضور صدق دل سے توبہ کرے، دل کی سیاہی ساری محرومی کی جڑ ہے۔ دل روشن اور پاکیزہ رہے تو تمام اعضا سے نیک اور خدا کی مرضی کے مطابق امور انجام پاتے ہیں اور دل میں ہی کجی رہی تو کوئی عضو نیک کام کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ایک موقع پر ارشاد فرمایا: [illegible] فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهُ، أَلاَ وَهِيَ الْقَلْبُ. [صحیح بخاری:۵۲] ’’خبردار! بلاشبہ بدن میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے، جب وہ ٹکڑا صالح رہتا ہے تو تمام بدن میں صالحیت رہتی ہے اور جب اس میں فساد پیدا ہوتا ہے تو پورے جسم کا نظام بگڑ جاتا ہے، خبردار! اور وہ ٹکڑا دل ہے۔‘‘

جسم کا نظام بگڑنے سے مراد اس سے صحیح افعال کا صادر نہ ہونا ہے، یعنی جب دل میں کجی اور فساد آتا ہے تو اعضا سے بھی برے افعال صادر ہوتے ہیں اور دل صحیح رہتا ہے تو وہ اعضا کو صحیح اور نیک کام کی ترغیب دیتا ہے اور انسان سے اچھے کام کا صدور ہوتا ہے اور اس پر دین کی باتیں اثر انداز ہوتی ہیں۔ ورنہ دل سیاہ رہتے ہوئے قیمتی سے قیمتی باتیں بے سود ثابت ہوتی ہیں۔ آپ اگر اپنی کامیابی چاہتے ہیں تو دل کو سیاہ ہونے سے بچائیں، گناہوں سے توبہ واستغفار کی عادت ڈالیں، توبہ اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہے، اس سے بڑے سے بڑا گناہ بھی ختم ہوجاتا ہے، اگر آپ نے گناہوں سے توبہ نہیں کی تو دل کی سیاہی بڑھتی جائے گی اور پھر اچھے اچھے دینی مضامین، اچھی کتابیں اور موثر خطاب بھی آپ کو صحیح رُخ نہیں دے سکتا۔ ضلالت وگمراہی آپ کا مقدر بن جائے گی جو ایک انسان کے لیے ایسی ہلاکت ہے جس سے بڑی کوئی ہلاکت نہیں۔

اسلام اور پاکستان

محمد عاصم حفیظ[۱]

اور کتاب مرگئی

تخلیق رک گئی .... علم اور اہل علم کا گلا گھونٹ کر ہم اب خود تماشہ بن رہے ہیں۔ پبلشر نے مصنف سے کتاب لکھوائی، معاوضہ دیا۔ کاغذ والے سے کاغذ خریدا، معاوضہ دیا۔ کمپوزر سے کمپوز کروائی، معاوضہ دیا۔ پروف ریڈر سے پروف ریڈنگ کروائی، معاوضہ دیا۔ ڈیزائنر سے ڈیزائننگ کروائی، معاوضہ دیا۔ پرنٹر سے پرنٹ کروائی، معاوضہ دیا۔ بائنڈر سے بائنڈنگ کروائی، معاوضہ دیا۔ ڈسٹری بیوٹر سے تقسیم کروائی، تگڑا کمیشن دیا۔ خریدار نے خریدی، اچھی لگی۔ اسکین کی، پی ڈی ایف بنائی اور... سوشل میڈیا پر ہزاروں لوگوں کو مفت میں بانٹ دی۔ پڑھنے والے نے مزے سے ڈاؤن لوڈ کر لی۔ ہزار روپے کا پیزا اور پانچ سو روپے کا برگر کھاتے ہوئے مفت میں پڑھ لی۔

مصنف اور پبلشر نے احتجاج کیا تو ان پر ’’علم دشمن‘‘ کا لیبل لگایا۔ برا بھلا کہا، طعنے دیے اور طنز کیا۔ پبلشر کو نقصان ہوا، اس نے مصنف کو معاوضہ دینا بند کر دیا۔ مصنف کو معاوضہ ملنا بند ہوا تو اس نے بھی لکھنا چھوڑ دیا...اور کتاب مرگئی! اچھے لکھاری کوئی اور کام کرنے لگ گئے۔ سوچنا چھوڑ دیا گیا۔ فکر کے در بند ہو گئے۔ اپنی سوچ، فکر اور تخلیق ختم ہوئی تو معاشرہ بیرونی کلچر کے زیر اثر آنے لگا۔ اب کتاب نہ خریدنے والے، مصنف کو رقم نہ دینے والے، سوچ و فکر کے ذریعے معاشرے کو راہ راست پر رکھنے والوں کو کوئی اور شعبہ اختیار کرنے پر مجبور کرنے والے سب مل کر شکوے شکایتیں کرتے ہیں کہ معاشرہ بگڑ رہا ہے۔ ہماری اولادیں تباہ ہو رہی ہیں۔ وہی دولت جسے علم دوست سرگرمیوں میں لگانے سے بچایا گیا تھا اب عیش و عشرت اور بے راہ روی میں خرچ ہو رہی ہے۔ کتنے ہی باصلاحیت تخلیق کار جنہیں آج معاشرتی اصلاح کا فریضہ سرانجام دینا چاہیے تھا وہ دوسرے شعبوں میں رزق کی تلاش میں سرگرداں ہیں کیونکہ لکھنے والوں کی کوئی قدر نہیں۔

---

[۱] پی ایچ ڈی سکالر، لیکچرر، صحافی

نوجوان ویلنٹائن ڈے کیوں نہ منائیں؟

ہیر رانجھا، لیلا مجنوں، سسی پنوں کی کہانیاں سن سن کر، غالب اور منٹو سے اردو سیکھ کر، شیکسپیئر اور مسٹر چپس سے انگریزی سیکھ کر، بھارتی گانوں پر سر دھننے والی، رومان بھرے پاکستانی ڈرامے دیکھنے والی یا اشتہارات میں جھومتے مناظر کا نظارہ کرنے والی، انگریزی کلچر کی شوقین، انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا جیسے فتنوں سے بھرپور دور میں جوان ہونے والی اس نسل سے اگر آپ یہ توقع کرتے ہیں کہ وہ ویلنٹائن ڈے پر حیا کا کلچر عام کرتے ہوئے روزے رکھ کر گزار دے گی تو یہ آپ کی بھول ہے۔ اسے حیا کا درس دیا ہی کب گیا ہے؟ اسے اسلامی طرز زندگی سے متعارف کرانے کا انتظام کہاں ہے؟ اس کی ذہنی آبیاری کا اہتمام کون کر رہا ہے؟ اس کو دینی شعور دیا ہی کب جاتا ہے؟ پہلے، سالوں پر محیط ایک خاص طرز زندگی میں بہتری کی سبیل کیجیے، اسے کچھ سکھا دیجیے پھر اس سے امیدیں باندھیے۔ نہیں تو بس خالی نعروں اور نصیحت آموز وعظوں میں کیا رکھا ہے؟ یہ تو شاید ان تک پہنچتے ہی نہیں جنہوں نے اسے منانا ہوتا ہے؟

خواتین ڈے پر مغربی سرمائے سے چلنے والی این جی اوز کے کارنامے

پاکستانی لبرل خواتین کی دینی اقدار سے کھلواڑ

حکومت کہاں سوئی ہوئی ہے؟

وویمن ڈے کے حوالے سے لاہور اسلام آباد اور کراچی میں ہونیوالے مظاہروں کی تصاویر سوشل میڈیا کا ہاٹ ایشو بن چکی ہیں۔ سنجیدہ حلقے انتہائی پریشان دیکھائی دیتے ہیں اور نصیحت آموز تحریریں لکھیں جا رہی ہیں۔ میری ذاتی رائے میں اس سارے ہنگامے کا ایک مثبت زاویہ بھی ہے جس پر کچھ زیادہ توجہ نہیں دی جا رہی۔ ان مظاہروں نے ایک بڑا مسئلہ حل کر دیا ہے اور ایک خفیہ ایجنڈے کو بے نقاب کیا ہے۔ دراصل مغربی فنڈڈ این جی اوز وقفے وقفے سے ایسے ہنگامے برپا کرتی رہتی ہیں۔ 'میرا جسم میری مرضی' اور 'کھانا خود گرم کرو' جیسے نعرے لگا کر، کم عمر شادی کے خلاف مہم چلا کر اور اسی طرح زینب کیس، قندیل بلوچ کیس اور اس جیسے معاشرتی واقعات کو لے کر عورت کی مظلومیت، آزادی اور حقوق کا ڈھنڈورا پیٹا جاتا ہے۔ اسلام پسند اور مشرقی روایات کے پیروکار دفاعی پوزیشن پر ہوتے ہیں۔ لمبی لمبی نصیحت آموز تحریریں اور قرآن وحدیث کے حوالے دے کر لکھنا پڑتا ہے کہ عورت کی آزادی کا جو

مغربی تصور یہ این جی اوز زدہ لبرل طبقہ پیش کر رہا ہے اس کے اصل مقاصد کیا ہیں۔ یہ دراصل مغربی طرز معاشرت چاہتے ہیں جس کے لئے خاندان کی تباہی اور عورت کو آزادی کے نام پر اپنی عیاشی کے لئے استعمال کرنے کی منصوبہ بندی ہے۔لیکن یقین مانیں یہ ساری تحریریں اتنا اثر نہیں ڈالتیں اور مغربیت و ماڈرن ازم سے متاثرہ طبقے کو اتنا متاثر نہیں کرتیں جتنا ان حیا باختہ پوسٹرز نے کیا ہے۔خواتین کی آزادی اور حقوق کے موضوع پر لکھتے ہوئے ''تنگ نظری'' اور ''مردانہ سوچ'' جیسے طعنوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔بعض روایتی گھرانوں کی نوجوان لڑکیاں بھی فیشن کے طور پر ان نعروں سے متاثر دیکھائی دیتی تھیں لیکن اس بار این جی اوز کے اصل ایجنڈے کی نقاب کشائی نے سارا مسئلہ حل کر دیا ہے۔

دین بیزار، ماڈرن ازم کی طرف راغب اور محض فیشن کے طور پر عورت کی آزادی کے مغربی تصورات کی حمایت کرنے والے طبقے اس بار منہ چھپاتے پھر رہے ہیں۔ان کے پاس ان فحش اور بے ہودہ پوسٹرز اور نعروں کا کوئی جواب نہیں۔ اس بار کسی نصیحت آموز تحریر کی ضرورت نہیں۔ عاجزی وانکساری اور قرآن وحدیث سے اسلامی دلائل دینے کی بھی ضرورت نہیں۔مسئلہ خود بخود حل ہو گیا ہے۔ایجنڈا واضح ہے کہ لبرل آنٹیاں ماضی میں جو مطالبے گھما پھرا کر کرتیں تھیں، اب سرعام ان کا اعلان کر دیا گیا ہے۔ یہ واضح ہو گیا ہے کہ مساوات، حقوق، شادی کی عمر بڑھانا، ملازمتوں کے مطالبے اور بڑے بڑے ہوٹلوں کے سیمینارز کے اصل مقاصد کیا ہیں۔ جو نوجوان لڑکیاں اس طبقے سے جانے انجانے میں متاثر ہو رہیں تھیں انہیں بھی خوب پتہ چل گیا ہے کہ لبرل آنٹیاں دراصل انہیں کہاں لے جانا چاہتی ہیں۔آپ کو ان کے اصل مقاصد بتانے کے لئے کسی قسم کے دلائل کی ضرورت نہیں بس ان نعروں اور پوسٹرز کی وضاحت پوچھ لیں۔ان کو کوئی الزام نہ دیں اور بحث نہ کریں:

''مَیں آوارہ مَیں بدچلن'' ''ہم بے شرم ہی صحیح'' ''میں اکیلی آوارہ آزاد''

''چادر اور چاردیواری۔ ذہنی بیماری'' ''شادی کے علاوہ بھی اور بہت کام ہیں''

رشتے نہیں، حقوق چاہئیں ''اپنا بستر خود گرم کرلو'' ''ناچ میری بلبل ناچ۔

تجھے کوئی کچھ نہیں کہے گا'' ''میری شادی کی نہیں آزادی کی فکر کرو''

اگر دوپٹہ اتنا پسند ہے تو آنکھوں پر باندھ لو ''میری شرٹ نہیں تمہاری سوچ چھوٹی ہے''

''مرد میرے سر کا تاج نہیں ہے''۔

ان نعروں کے علاوہ تصاویر سے فحش ترین پورٹریٹ بھی بنائے گئے۔ ''کھانا خود گرم کر لو'' کے ساتھ ہی عاصمہ جہانگیر کی بہن حنا جیلانی کے ساتھ کھڑی ایک لبرل آنٹی نے ''مجھے ٹائر بدلنا آتا ہے'' کا پوسٹر بھی پکڑ رکھا تھا۔ ''اپنا ٹائم آگیا'' کے پوسٹر پر بنے ہاتھوں میں سگریٹ بھی تھی اور فحش اشارے بھی۔ ''بستر گرم'' کرنے سے لے کر ماہواری تک کی تشہیر کی گئی۔ ٹائر بدلنے کا ہنر جاننے والی آنٹی موزہ ڈھونڈنے سے انکار کرتی دکھائی دی۔ خیر ان پوسٹرز میں اور بھی بہت کچھ تھا جو ان تمام عزائم کا اظہار تھا کہ این جی اوز اور لبرل و ماڈرن بنتے اس طبقے کے نزدیک آزادیٔ نسواں اور عورت کے حقوق سے مراد کیا ہے؟

یقیناً یہ چھوٹا سا طبقہ پورے معاشرے کا عکاس نہیں ہے ہاں البتہ یہ پہلی مرتبہ ہوگا کہ خواتین کے بنیادی حقوق کے لئے جدوجہد کرنے والے سنجیدہ حلقے یہ کہتے پائے گئے کہ ان بے لگام اور آوارہ گرد و بے شرم ہونے کی دعویدار این جی اوز والی آنٹیاں خواتین کی اصل نمائندہ نہیں ہیں۔ ہم تو پہلے ہی کہتے تھے کہ ان کے مقاصد کچھ اور ہیں لیکن کچھ حلقوں کو یہ بات سمجھ نہیں آتی تھی۔ شکر ہے اب انہیں بھی احساس ہو جائے گا۔ کوئی بھی معاشرہ خواتین کے حقیقی کردار کے بغیر ترقی نہیں کر سکتا اور کوئی بھی ان سے انکار نہیں کر سکتا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس سب کا تعین معاشرتی و دینی روایات کے دائرے میں ہی ممکن ہے۔ بے لگام آزادی اور آوارہ ذہن انتشار کا باعث ہے جبکہ عورت کے حقوق کا مغربی تصور ہماری معاشرتی روایات کا عکاس نہیں۔ یہ سب خواتین کے حقوق کے کھوکھلے نعروں کا اظہار تھا جس کی نمائش سڑکوں پر کر دی گئی۔ حکومتی اداروں کے لئے لمحہ فکریہ ہونا چاہیے کہ یہ سرگرمیاں معاشرتی انتشار کا باعث بنتی ہیں۔ جس طرح نیشنل ایکشن پلان کے تحت نفرت آمیز مواد کو کنٹرول کیا گیا بالکل اسی طرح انتشار اور فحاشی و بے راہ روی کے ان مظاہروں کو بھی کنٹرول کرنے کی ضرورت ہے۔

ایک سبق مغربیت و ماڈرن ازم سے متاثر ہونے والی نوجوان نسل کے لئے بھی ہے کہ اس مغربی طرز معاشرت کی معراج یہی وہ سب کچھ ہے جس کے نعرے یہ لبرل آنٹیاں لگاتی رہی ہیں۔ انہیں خوب سوچ لینا چاہیے کہ کس طرز زندگی کے ساتھ چلنا ہے خود کو فخریہ اور علی الاعلان بدچلن، آوارہ اور بے شرم قرار دینے والوں کے ساتھ یا ایک باوقار، باعزت خاندانی نظام کے تحت سعادت بھری زندگی۔ یہ درد بھرے لہجے میں ان سے درخواست بھی ہے اور ان کی ہدایت و اصلاح کے لئے صدق دل سے دعا بھی۔ آیئے ایک باعزت، باوقار اور محفوظ زندگی کی طرف۔ آپ کو حقوق بھی ملیں گے اور آزادی بھی۔

عالم اسلام مدیر

افغان طالبان ۔خبردار، ہوشیار!

عیار امریکہ میدانِ جنگ میں ہاری ہوئی بازی مذاکرات کی میز پر جیتنے کے لیے کوشاں ہے

ہم طالبانِ افغانستان کو مبارکباد دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں عالم کفر کے خلاف جہاد کی توفیق دی اور اس میں کامیابی عطا فرمائی اور امریکہ و یورپ اپنی جدید ترین ٹیکنالوجی پر مبنی ابلاغی اور حربی بالادستی کے باوجود افغانستان کو فتح کرنے اور وہاں اپنی مستحکم حکومت قائم کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ تاہم ابھی منزل نہیں آئی، ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں۔ امریکہ کی کوشش ہے کہ:

۱۔ وہ کسی طور اپنی شکست کو فتح کا نام دے سکے۔

۲۔ افغاستان میں کسی نہ کسی بہانے اور کسی نہ کسی سطح پر اپنی موجودگی برقرار رکھ سکے۔

۳۔ جو گماشتہ جمہوری نظام اس نے کابل میں قائم کر رکھا ہے، اسے برقرار رکھ سکے۔ بلکہ ہو سکے تو طالبان کو اس نظام کا حصہ بنا سکے۔

۴۔ اگر طالبان کابل کے گماشتہ جمہوری نظام کا کسی طور حصہ بننے پر آمادہ نہ ہوں تو دونوں کو مستقل حیثیت دے دی جائے۔ کابل کے نظام کی دامے، درمے، سخنے اعلانیہ یا پس پردہ رہ کر مدد کی جائے اور طالبان کے نظام کو ناکام بنانے کی کوشش کی جائے۔

۵۔ کابل کے گماشتہ نظام اور طالبان کو آپس میں لڑا دیا جائے۔ کابل نظام کی اسلحہ و بارود سے مدد کی جائے تا کہ فریقین آپس میں لڑتے رہیں، افغان مرتے رہیں اور دونوں غیر مستحکم رہیں۔

۶۔ پوری کوشش کی جائے کہ طالبان کو سارے افغانستان پر مستحکم حکومت قائم کرنے اور اسلام نافذ کرنے کا موقع نہ ملے۔

یہ اور اس طرح کے مزید بہت سے خدشات ہیں جن کے لیے امریکی کوشش کر رہے ہیں اور کرتے رہیں گے۔ اب یہ طالبان قیادت کی جرأت و فراست کا امتحان ہے کہ جو بازی انہوں نے ہزاروں جانوں کی قربانی دے کر جیتی ہے اسے مذاکرات کی میز پر نہ ہاریں بلکہ دشمن کی

لفاظی، عیاری اور ہوشیاری سے بخوبی نمٹیں۔

حضرت امام احمد بن حنبلؒ فرمایا کرتے تھے کہ حکومت کے کوڑوں کے مقابلے میں وہ موقع زیادہ آزمائش کا تھا جب میرے لیے اشرفیوں کے توڑوں کے منہ کھول دیے گئے، لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں اس آزمائش میں بھی سرخرو رکھا۔ ہم اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہیں کہ وہ طالبان کو مذاکرات کی اس آزمائش میں سرخرو رکھے، وہ امریکہ کے ابلیسی حیلوں اور چالوں کا توڑ کر سکیں اور اپنے مقاصد میں کامیاب ہو سکیں۔

بقیہ: ردّ عمل کی پیداوار جدید دینی تحریکیں

علماء ریاست اور قومی ریاست کی جدید تشکیل سے واقف ہی نہیں۔ متشددین کے سوال کا دوسرا جواب علماء کے پاس یہ ہوتا ہے کہ آپ جمہوری جدوجہد میں حصہ لیں مگر اس کا انجام ان کے سامنے ہے۔ الجزائر، مصر، ترکی میں کیا ہوا؟ علماء کرام انٹرنیشنل ہیومن رائٹس کمیشن کا فیصلہ Rafah vs Turkey پڑھ لیں مگر وہ تو ان مباحث کو پڑھنے کے لیے تیار ہی نہیں۔ وہ رہنمائی نہیں کر رہے۔ لہٰذا ردّعمل کی تحریکوں کو عالم اسلام میں مقبولیت حاصل رہے گی مگر ان کا انجام نہات بھیانک ہے۔ امت اس کی عورتیں، اس کے بچے علماء کی رہنمائی کے منتظر ہیں۔

عالم اسلام لہولہو ہے۔ ہر طرف بچے، عورتیں، جوان خون میں لتھڑے ہوئے ہیں۔ ان کے زخمی جسم، کچلی ہوئی روحیں، بکھرے ہوئے گھرانے، دربدر ہوتی عورتیں اور بچے ان کی آہیں، چیخیں، کراہیں، فریادیں، آنسو اس امت اور اس کی علمیت، فراست، غیرت کو جگانے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔

ہمیں ٹھنڈے دل سے سوچنے کی ضرورت ہے کہ ہمیں ایک نئی حکمت عملی کی ضرورت ہے۔ یہ حکمت عملی قرآن وسنت میں موجود ہے مگر ہماری توجہ کا مرکز نہیں۔ ہماری توجہ صرف دو امور پر ہے: سب سے پہلے جمہوری جدوجہد اور اس میں ناکامی پر دوبارہ جمہوریت پر اعتماد واعتقاد۔ گزشتہ سو سال میں اکثر اسلامی تحریکوں کا سفر اس دائرے سے اوپر اٹھنے، اپنی تاریخ سے رجوع کرنے اور اپنے اسلاف، بزرگوں اور اکابرین سے رہنمائی لینے کے لیے تیار نہیں کیونکہ وہ ردّعمل کی پیداوار ہیں اور ردّعمل کا کوئی نظریہ نہیں ہوتا۔

اسلام اور عصر حاضر سید خالد جامعی

ردّعمل کی پیداوار جدید دینی تحریکیں

داعش (ISIS) ردّعمل اور کسی ایک نکتے پر تحریک چلانے کی ایک عمدہ مثال ہے۔ ردّ عمل کا کوئی نظریہ نہیں ہوتا (Reaction has no Ideology) لیکن انتقام اور ردّعمل کو بھی اظہار کے لیے ایک نظریے سے منسوب کرنا ضروری ہوتا ہے۔ روہنگیا مسلمانوں کو ملک بدر کرنے کے لیے برمی بدھ مت قوم پرستی کو استعمال کیا گیا حالانکہ بدھ مت دنیا کا وہ مذہب ہے جو کسی دفاعی اور اقدامی جہاد کا قائل ہی نہیں۔ بدھ مت انسانوں کو قتل کرنے کی تعلیم نہیں دیتا لیکن قاتل چونکہ بدھ مت والے تھے لہٰذا میڈیا اسلام اور بدھ مت کی جنگ کے مناظر پیش کرتا رہا۔

نیویارک ٹائمز کی رپورٹ کے مطابق شام میں روج کیمپ کے اندر چالیس ملکوں کی ۱۴۰۰ مسلمان عورتیں اپنی قسمت کا ماتم کررہی ہیں۔ ان میں ترکی، امریکا اور روس کی عورتیں بھی شامل ہیں جو داعش کے ساتھ آئی تھیں۔ نیویارک ٹائمز نے اس صورتِ حال پر (Tainted by Terror: Stuck in Limbo) کے نام سے رپورٹ شائع کی ہے۔

ان ۱۴۰۰ لاوارث مسلمان عورتوں کے ساتھ ۹۰۰ بچے بھی ہیں جن کے باپ، بھائی، چچا، ماموں کسی کا پتہ نہیں۔ ان عورتوں کے ممالک ان عورتوں اور بچوں کو لینے پر تیار نہیں۔ قومی ریاستوں نے شدید مسائل اور تشدد پیدا کیا ہے جس کے جواب میں مسلسل تشدد پیدا ہورہا ہے۔ عدم ریاست کی شکار ان عورتوں اور بچوں کا مستقبل کیا ہے؟ کردستان والے کہہ رہے ہیں کہ ہم ان عورتوں کو کیوں رکھیں؟ یہ ہماری شہری نہیں اور نہ ان کی خوراک ودوا ہماری ذمے داری ہے۔ ان عورتوں میں سے بہت کے شوہر فرار ہوگئے ہیں۔ اپنے خاندان کو اجنبی ملک میں لاکر اجنبیوں کے سپرد کرکے وہ خود چلے گئے ہیں۔ یہ جدید جہاد ہے۔ ان کیمپوں میں رہنے والی عورتوں بچوں کو کوئی مسلمان ملک خوراک مہیا نہیں کررہا، یہ کام امریکہ کررہا ہے۔ اپنی امت کے گم کردہ راہ، بھٹکے ہوئے نوجوانوں اور ٹھکرائی ہوئی عورتوں اور بچوں کی ذمے داری

امت کی ہے یا امریکہ کی؟ عافیہ کے لیے تحریکیں چلانے والے ان عورتوں کے بارے میں کیا سوچ رہے ہیں؟ پونے دوارب کی امت دو ہزار عورتوں اور معصوم بچوں کو آباد نہیں کر سکتی؟ ایسی لاتعلقی کس بات کی علامت ہے؟

عالم اسلام کا المیہ یہ ہے کہ جو تحریک جس دائرے میں کام کر رہی ہے اس دائرے کے مطالبات اور تقاضوں پر کامل توجہ مرکوز نہیں کر رہی اور وہ اس دائرے کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرنے سے قاصر ہے۔ عجلت، ہتھیلی پر سرسوں جمانا، ہر شخص کو مجاہد ملت اور امیر ملت بننے کا شوق، جو میڈیا کا تحفہ ہے، اس نے مستحکم تحریکوں کو بھی متاثر کیا ہے۔ جو جماعتیں سیاسی عمل اور جمہوریت میں شامل ہیں وہ نہ جدید ریاست سے واقف ہیں اور نہ جمہوریت کی حقیقت سے۔ انہیں سٹیٹ اور نیشن کا فرق بھی نہیں معلوم۔ امریکہ افغانستان میں اسٹیٹ تعمیر کر رہا ہے اور عراق میں نیشن۔ یہ تحریکیں جمہوری سرمایہ دارانہ ریاست وسیاست کے اس دائرے میں جدوجہد کی حکمتوں، نزاکتوں سے بھی واقف نہیں۔ انہوں نے جو راستہ طے کر لیا ہے اسے عقیدت اور عقیدے کا درجہ دے دیا ہے۔ ظاہر ہے عقیدہ تبدیل نہیں ہوسکتا، عقیدت ختم نہیں ہوسکتی حالانکہ حکمت عملی عقیدہ نہیں ہوتی، یہ تجرباتی شے ہے۔ ہر تجربے کے بعد نئ حکمت علی اختیار کی جاسکتی ہے۔ یہ عقیدہ نہیں عمل کا میدان ہے۔ عالم اسلام میں اس وقت جو تحریکیں اُٹھ رہی ہیں وہ ہمارے اندرونی تقاضے اور داخلی ضروریات کے تحت نہیں بلکہ غصے، انتقام، اشتعال اور مغرب کو شکست دینے کے ردّعمل کی نفسیات سے اُٹھ رہی ہیں۔ فیس بک اور انٹرنیٹ کے ذریعے مسلمانوں پر ہونے والے مظالم ہر حساس دل کو تڑپا دیتے ہیں لیکن صرف تڑپ، کسک اور درد کسی بحران کا علاج اور کسی مرض کی دوا نہیں ہوتے۔ افسوس یہ ہے کہ اکثر تحریکیں نہ مغرب سے واقف ہیں، نہ اس کی کمزوریوں سے اور نہ اس کی طاقت کے دائروں سے۔ ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ مغرب کہاں کہاں کم زور ہے اور یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ ہم کہاں کہاں طاقت ور ہیں کہ مقابلہ تبھی ممکن ہوگا۔ مغرب سے مقابلے کے لیے نہایت سنجیدہ غور وفکر اور تدبر کی ضرورت ہے مگر ان تحریکوں کے پاس نہ اس کا وقت ہے نہ اس کی ضرورت، وہ تو بس کچھ کر گزرنا چاہتی ہیں۔ ان کے لیے جوش، جذبہ اور اقدام ہی سب کچھ ہے۔ اس کے لیے کسی منصوبہ بندی اور شعور کی زیادہ اہمیت نہیں۔ راسخ العقیدہ سنجیدہ علمی حلقے یا تو ان تحریکوں کی

حمایت کر دیتے ہیں یا ان کی مخالفت کرتے ہیں یا خاموش رہتے ہیں۔ وہ پر جوش نوجوانوں کے اضطرار، غصے، اضطراب، بے قراری کے ازالے، امالے کے لیے علمی، عملی رہنمائی نہیں کر رہے۔

عورتوں بچوں سے متعلق ان رپورٹوں کو پڑھ کر جن کا کوئی والی وارث نہیں، جنہیں کوئی قبول کرنے پر تیار نہیں، ہمارا دل خون کے آنسو روتا ہے۔ ان بچوں اور عورتوں کے بارے میں سوچ کر کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ ردّعمل اور انتقامی جدوجہد کسی خیر کی بجائے کتنے نئے مسائل پیدا کرتی ہے ہماری جدید اور جدیدیت زدہ مذہبی تحریکیں ان اُمور پر غور کرنے کے لیے تیار ہی نہیں۔

سانحۂ لال مسجد کے موقع پر ہم نے لال مسجد کی حکمت عملی کے حامی بعض مخلص دانشوروں (ڈاکٹر زاہد صدیق مغل، ڈاکٹر محبوب بخاری، ڈاکٹر جاوید انصاری، جناب مفتی محمد احمد) کی خدمت میں اسلامی علمیت کے تناظر میں پچاس سوالات پیش کیے تھے جن کے جوابات ہمیں آج تک نہیں ملے لیکن وہ سوالات آج بھی جوں کے توں غور وفکر کا تقاضا کرتے ہیں۔ ان محترم مخلص حضرات کا خیال تھا کہ لال مسجد پیرس کمیون ہے جہاں سے انقلاب کا آغاز ہوا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ یہ انقلاب کا پہلا پڑاؤ ہے اور لال مسجد تحریک قافلۂ حسینی کی پکار ہے۔ پاکستان کی ہر مسجد کو لال مسجد بنا دینا چاہیے۔ انقلاب کا وقت آچکا ہے۔ ظاہر ہے یہ نقطۂ نظر درست نہیں تھا۔ اس تنقید پر وہی سوال دوبارہ اٹھایا جائے گا جو لال مسجد والوں اور تحریک طالبان پاکستان نے اٹھایا تھا کہ اچھا اگر ہمارے مطالبات درست ہیں، صرف طریقۂ کار غلط ہے تو علماء ہمیں صحیح طریقۂ کار بتادیں۔ اس سوال کے جواب میں علماء نے خاموشی اختیار کر لی اور کئی سالوں بعد 'پیغامِ پاکستان' کی صورت میں جو جواب دیا وہ یہ تھا کہ جہاد صرف ریاست کا حق اور اختیار ہے جب کہ آئین پاکستان کی دفعہ ۲۴۵ کے تحت پاکستان کی ریاست نے خود کو جہاد کا حق نہیں دیا۔ اس شق میں جہاد اور قتال کی اصطلاح سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔ علماء کو یہ بھی معلوم نہیں کہ جدید ریاست سیکولر، لبرل ہوتی ہے وہاں جہاد نہیں ہوسکتا۔ جہاد کفر کے خلاف ہوتا ہے لیکن ہیومین رائٹس ڈیکلریشن میں کفار نہیں ہوتے انسان ہوتے ہیں اور تمام انسان برابر ہوتے ہیں۔ تمام قومی ریاستیں اقوام متحدہ کی رکن ہیں اور اس کے تمام کنونشن اور معاہدوں (Covenants) کی پابند ہیں لہٰذا کوئی ریاست دوسری کے خلاف جہاد، قتل، جنگ کچھ بھی نہیں کرسکتی۔ (بقیہ صفحہ نمبر: ۳۴)

مختصر تبصرہ مدیر

مختصر خبریں۔ مختصر تبصرے

❁ مسجد نبوی کے امام اور جامعہ مدینہ کے شعبہ علوم القرآن کے سابق سربراہ ڈاکٹر امام شیخ احمد العماری جیل میں وفات پاگئے۔ (اناللہ وانا الیہ راجعون)۔ محمد بن سلیمان کے سعودی عرب سے اب اسی قسم کی خبریں آیا کریں گی۔ مغرب کی فکری غلامی کا حاصل یہی ہے کہ عورتوں کو آزادی دو اور علماء کی آزادی ختم کرو۔

❁ مصر کی جامعۃ الازہر نے اس طالب علم اور طالبہ کی رجسٹریشن بحال کردی جن کی وڈیو وائرل ہونے پر رجسٹریشن معطل کی گئی تھی۔ ہوا یوں تھا کہ جامعہ میں اور بیسیوں طلبہ وطالبات کی موجودگی میں ایک نوجوان نے ترنگ میں آکر بھانڈوں کی طرح لڑکی کے آگے جھک کر کہا کہ میری محبت اور پروپوزل قبول کرو۔ لڑکی کے سر ہلانے پر لڑکے نے اسے خوشی سے گلے لگایا اور گول گول گھمانا شروع کیا۔ لڑکا ابھی اسے دبوچے ہوئے تھا اور شاید کچھ اور بھی کرتا کہ لڑکی کی ایک سہیلی نے اسے پیار سے جاکر چھڑالیا۔ (کیا جامعۃ الازہر کی انتظامیہ کو اس آزادی اور کھلے پن پر مبارک باد دی جائے ؟ اہل مغرب کو پاکستان کے دینی مدارس پر غصہ یہی ہے کہ یہاں مصر جیسا ماحول کیوں نہیں ہے؟)

❁ عمان کے ایک نوجوان نے سوشل میڈیا پر مسقط عمان میں دکھائی جانے والی بھارتی فلم The Surgical Strike پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ اسلامی پاکستان کے خلاف فلمیں ہم عمانیوں کو کیوں دکھائی جارہی ہیں؟ (وزیر اطلاعات فواد چودہری کو اگر اپوزیشن کے خلاف بڑھکوں اور دینی روایات کے خلاف بیانات دینے سے فرصت ملے تو وہ ان جیسے امور پر توجہ دیں اور پاکستان کے خلاف مکروہ بھارتی پروپیگنڈے کا توڑ کرنے کا سوچیں۔)

❁ وزیر تعلیم سندھ نے اعلان کیا ہے کہ نصاب میں موسیقی کو لازم کیا جارہا ہے۔ اس کے

لیے پہلے مرحلے میں تین سو اساتذہ بھرتی کیے جائیں گے۔ (پہلے بھانڈ تیار کرنے کی فیکٹری لگالیں تاکہ اساتذہ ملنے میں آسانی رہے)۔

❁ یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی لاہور کی انتظامیہ نے طلبہ کے لیے جینز پہننے پر پابندی لگادی اور طالبات کے لیے سر ڈھانپنا لازمی قرار دے دیا ہے۔ اس پر وائس آف امریکہ کی اردو سروس نے ایک پول کروایا جس میں ۱۰۰، ۲۲ لوگوں نے رائے دی۔ ان میں سے ۹۱ فیصد لوگوں نے یونیورسٹی انتظامیہ کے فیصلے کی حمایت کی اور صرف ۹ فیصد نے اس کے خلاف رائے دی (سیکولر اور لبرل صحافی ودانشور اسلام کا نہیں تو کثرت رائے ہی کا احترام کرنا سیکھ لیں)۔

❁ اسلاموفوبیا پر مبنی مواد سوشل میڈیا پر شیئر کرنے والے برطانوی پارلیمنٹ میں ٹوری پارٹی کے ۱۴ ارکان کی رکنیت معطل کردی گئی۔ (کیا شراب کے حق میں تقریریں کرنے والے پاکستانی اراکین اسمبلی پر اس کا اطلاق نہیں ہوسکتا؟)

❁ پنجاب حکومت نے اسلامیات کے اساتذہ بھرتی کرنے کے لیے کل تعداد کا ۵ فیصد غیر مسلم اساتذہ کے لیے وقف کردیا ہے۔ (کیا آپ مشرقی پاکستان کا حشر بھول گئے جہاں ہندو اساتذہ مسلمان بچوں کو اسلامیات پڑھاتے تھے؟)

❁ القاعدہ رہنما کی اہلیہ نے انسانی حقوق کی جنگ جیت لی۔ یورپین ججز نے ان کے حق میں فیصلہ دیتے ہوئے برطانوی ائیرپورٹ پولیس کی جانب سے انہیں فرانس سے واپسی پر جہاں وہ اپنے خاوند سے ملنے گئی تھیں، گرفتار اور ہراساں کرنے کو غیر قانونی قرار دے دیا (اس سے پہلے یورپین کورٹ آف جسٹس نے اس اصول کو غیر قانونی قرار دیا تھا کہ آزادیٔ اظہار رائے کے اصول کے تحت نبی کریم ﷺ کی توہین کرکے مسلمانوں کے دل چھلنی کیے جاسکتے ہیں؟ کوئی ہے جو ان فیصلوں کو ہماری سپریم کورٹ کے ججوں تک پہنچاسکے؟)

اسلام اور مغرب مدیر

نیوزی لینڈ میں مسلمانوں کا قتل عام

مغرب میں اسلام اور مسلمانوں کے تحفظ کے لیے امت کو تدبر اور فعال اتحاد کی ضرورت ہے

۱۔ مسلمانوں کے قتلِ عام پر نیوزی لینڈ کی حکومت کا رویہ اور ردِّعمل اتنا متوازن، موثر اور بعض لوگوں کی رائے میں اتنا خوبصورت رہا ہے کہ اس پر الزام تراشی فضول ہے، اگرچہ اس سے انکار ممکن نہیں کہ وقوعہ وہیں ہوا، اس کی اخلاقی اور قانونی ذمہ داری اُسی پر ہے اور توقع ہے کہ وہ دہشت گرد مجرم کو اپنے قانون کے مطابق کڑی سزا دے گی۔

۲۔ مسلمانوں کو مظلومیت اور اس پر صبر سے جو مثبت تاثرات، ان کے اور اسلام کے بارے میں دنیا بھر میں اُبھرے ہیں، ان سے فائدہ اٹھانا چاہیے اور ان کا تقاضا ہے کہ امن برقرار رکھا جائے اور انتقام اور بدلے کے نام پر کسی احمق 'مجاہد' کو چاقو لے کر پِل پڑنے والی حرکت نہیں کرنی چاہیے اور تشدد و دہشت گردی کا جواب تشدد اور دہشت گردی سے نہیں دینا چاہیے۔ ہماری رائے میں ایسا کرنا حماقت اور اسلام اور مسلمانوں کے لیے نقصان دہ ہے اور اس میں اسلام دشمنوں کا فائدہ ہے۔

۳۔ 'مغرب میں اسلام اور مسلمانوں کا مستقبل' کے موضوع پر امت کے اہل حل وعقد کو غور کرنا چاہیے۔ اگر انہیں اس کی توفیق نہ بھی ملے تو امت کے دانشوروں، صحافیوں، جامعات اور تھنک ٹینکس کو اس پر ضرور تدبر کرنا چاہیے اور اس موضوع پر متعدد اور مسلسل علمی کانفرنسیں اور تحقیقی ورکشاپس منعقد کرنی چاہئیں اور امریکہ و یورپ میں اسلام کی نشر و اشاعت کے لیے مربوط، سوچی سمجھی اور منصوبہ بند (Planned) حکمت عملی وضع کر کے اس پر عمل کرنا چاہیے۔

۴۔ ماضی بعید، قریب اور حالیہ بے شمار واقعات اس امر کے مظہر ہیں کہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف عالم کفر (خصوصاً امریکہ، یورپ، آسٹریلیا اور دنیا بھر میں پھیلے ہوئے ان کے حلیف) اسلام اور مسلمانوں کے خلاف متحد ہیں یا وقت پڑنے پر متحد ہو جاتے ہیں۔ ان کا مقابلہ کوئی ایک حکمران یا مسلم حکومت نہیں کر سکتی۔ امت کو اگر اپنی جان اور ایمان بچانا ہے تو

اسے موثر اور فعال انداز میں متحد ہونا پڑے گا ورنہ مسلم ممالک ایک ایک کر کے تباہ ہوتے رہیں گے جیسا کہ عراق، افغانستان اور لیبیا کے ساتھ ہو چکا، یمن اور شام میں ہو رہا ہے اور پاکستان، ایران، سعودی عرب پر دباؤ موجود ہے۔

۵۔ نیوزی لینڈ میں مسلمانوں کا جو قتل عام ہوا، اسے کوئی انفرادی واقعہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ ایک جنونی دہشت گرد نے مشتعل ہو کر یہ قتل عام کر دیا ہے (خود اس دہشت گرد نے حملہ کرنے سے پہلے اپنا منشور آن لائن کیا جس میں سفید فاموں کی نسلی برتری اور مسلمانوں سے نفرت نمایاں ہے۔ پھر اس کے ہتھیاروں پر ان واقعات اور افراد کے نام کندہ ہیں جو مسلمانوں سے کشمکش اور انہیں شکست دینے یا نقصان پہنچانے میں معروف اور تاریخی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ نفرت اور انتقام پر مبنی مسلمانوں کو زک پہنچانے کی ایک فکری اور شعوری کاوش تھی) بلکہ اسلام سے نفرت اور مسلمانوں سے دشمنی ایک ذہن اور رویہ ہے جو مغرب میں عام ہے اور اسے مزید پھیلایا اور مستحکم کیا جا رہا ہے۔ اس کا مہذب نام 'اسلاموفوبیا' ہے۔ اس کی جڑیں ماضی بعید اور قریب سے لے کر حالیہ واقعات تک پھیلی ہوئی ہیں۔ صلیبی جنگیں، مسلمانوں کو کمزور پا کر ان کے خلاف سازشیں، قوت سے ان کو کچلنا، لوٹنا، تباہ کرنا، مسلم دنیا پر قبضہ، پھر اس کے اجتماعی ڈھانچے کو منہدم کر کے اپنی فکر، تہذیب، اقدار کے مطابق ان کی تشکیل نو اور مسلمانوں کو ہمیشہ غلام رکھنے کے لیے کامیاب فکری وثقافتی کاوشیں، مسلمان ملکوں کی آزادی کے بعد وہاں اپنے تربیت یافتہ طبقات کی حکومت، سیاسی عدم استحکام پیدا کرنا، ان کو معاشی طور پر نہ ابھرنے دینا، اس کے باوجود کچھ ممالک سر اٹھانے کے قابل ہو گئے تو انہیں قوت سے تباہ کرنا، ۱۱/۹ کا واقعہ، عالم اسلام میں شریعت نافذ نہ ہونے دینا، دینی قوتوں کو گماشتہ حکمرانوں کے ذریعے کمزور اور غیر موثر کرنا، عالم اسلام میں اتحاد نہ ہونے دینا، مسلم مزاحمتی تحریکوں میں اپنے آدمی داخل کرنا، یورپ میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف نفرت کو ہوا دینا، عورتوں کے حجاب اور مسجد کے میناروں کے خلاف مہمیں چلانا اور صہیونیوں، انتہا پسند مسیحیوں (نیوکانز) اور مغربی فکر و تہذیب کی گلوبلائزیشن کے علمبرداروں کا اتحاد اور مغربی حکمرانوں اور عامۃ الناس کی ان کی پشت پناہی.... غرض ایک طویل سلسلۂ واقعات ہے جو باہم مربوط ہے اور جس میں ہم خیالی اور مقصدیت ہے۔

جب تک عالم اسلام کے حکمران خواب غفلت سے بیدار نہ ہوں گے، دشمن کی فکر، چالوں اور سازشوں کو نہ سمجھیں گے اور مل کر ان کا توڑ کرنے کی کوشش نہ کریں گے، کوئی مسئلہ حل نہ ہوگا۔ اس ہدف کے حصول کے لیے کوششیں جاری رکھنی چاہئیں اور جب تک یہ نہیں ہوتا اس وقت تک پرائیویٹ سیکٹر میں امہ کے ان دانشوروں، علماء، سیاستدانوں، تاجروں، اساتذہ، طلبہ، وکلاء کے حلقے منظم اور فعال کرنے چاہئیں جن کی سوچ اسلام اور مسلمانوں کی سربلندی کی ہو اور جو مغربی فکر و تہذیب کے علمبردار ممالک کی اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سازشوں سے بچنا چاہتے ہوں۔

ہم نے یہ رائے پہلے بھی پیش کی ہے، اب دوبارہ پیش کر رہے ہیں۔ کاش ہمارے پاس طاقت اور وسائل ہوتے کہ ہم اس پر عمل کر سکتے۔ جن لوگوں کو ہماری اس تجویز سے اتفاق ہو ان کا فرض ہے کہ وہ اس پر عمل درآمد کا سوچیں۔

بقیہ: مغربی تہذیب۔لبرل ازم کے نام پر جبر

انسان کی نجی زندگی بھی آلات کے ذریعے ریاست کی دسترس میں آچکی ہے گویا پرائیویسی کا خاتمہ۔ پاکستانی لبرل ابھی تک مذہبی جبر کے خلاف آوازیں بلند کر رہے ہیں مگر آزادی کے بے تحاشہ جبر پر چپ ہیں۔ شرمین عبید چنائے کبھی صبح سویرے ماؤں کے ہاتھوں بچوں پر ہونے والے مظالم پر فلم نہیں بنائے گی کیونکہ یہ فلم مذہب کے خلاف دلیل فراہم نہیں کرتی بلکہ مغرب، لبرل ازم، فریڈم اور آزادی کے عقیدے کے جبر کی ہولناک کہانی سناتی ہے اور اس پر آسکر ایوارڈ بھی نہیں ملے گا، نہ نواز شریف اسے ایوان وزیر اعظم میں گھسنے دیں گے، نہ اس کی عزت ہوگی، نہ دولت ملے گی، نہ اخباروں میں اس کا چرچا ہوگا۔ عزت، دولت اور شہرت صرف اسے ملتی ہے جو اسلام کے جسم پر زخم لگائے اور مغرب کے عقیدۂ آزادی کو عام کر دے۔ پاکستان کی سپریم کورٹ نے کبھی بچوں کے خلاف ہونے والے اس جبر کا سُوموٹو نوٹس نہیں لیا کیونکہ خود عدالت عظمیٰ کے جج اور ان کے گھروں کے بچے اسی طریقے سے تعلیم حاصل کرتے ہیں اور یہ جبر جائز ہے کیونکہ اس جبر سے علم، تہذیب، اعتماد، نوکری، دولت، عزت، شہرت اور بلندی ملتی ہے، بس ممتاز قادری کا مذہبی جبر ناجائز تھا۔

اسلام اور مغرب　　سعدیہ عمر شیخ

عالمِ اسلام کے خلاف نو استعماری حربے

مغرب 'توہینِ رسالت' کو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کر رہا ہے

عالمِ اسلام مختلف وجوہات کی بنا پر دورِ حاضر کی نو استعماری طاقتوں کا ہدف ہے اور اس بار مغربی استعمار کی یلغار بھی ہمہ جہت ہے۔ امت مسلمہ کو آج ایک سنگین چیلنج کا سامنا ہے۔ وہ نظریاتی، تہذیبی، معاشی اور عسکری سطحوں پر مغرب کے استعماری حملوں کی زد پر ہے۔ باوجود اس کے کہ عالم اسلام کو یورپی استعمار کی براہِ راست غلامی سے نجات ملے نصف صدی سے زائد عرصہ بیت چکا ہے مسلمان ابھی تک انحطاط اور تنزل کا شکار ہیں اور اس قعرِ ذلت سے نکلنے کے لیے کوئی مؤثر لائحہ عمل ترتیب نہیں دے سکے۔ جہاں مغرب سیاسی، معاشی، ثقافتی اور سائنسی میدانوں میں ساری دنیا پر اپنی اجارہ داری قائم کر چکا ہے وہیں مسلمانوں کی صورتِ حال یہ ہے کہ تعداد میں تقریباً پونے دو ارب ہونے کے باوجود ان کی کیفیت اس وقت بالکل وہی ہے جس کا نقشہ نبی اکرم ﷺ نے اپنی ایک حدیث میں کھینچا تھا کہ مجھے اندیشہ ہے کہ ایک زمانہ آئے گا کہ نہایت کثیر تعداد میں ہونے کے باوجود تمہاری حیثیت سیلاب کے ریلے کے اوپر کے جھاگ سے زیادہ نہیں رہے گی۔ (۱)

توہینِ رسالت کو بطور ہتھیار استعمال کرنا

جب سے اسلام کی روشنی عرب کی سرحدوں سے نکلی ہے اور اسلام اور عیسائیت کا آمنا سامنا ہوا ہے اس وقت سے عیسائیت اور یورپ نے اسلام کے خلاف اپنی جنگ کا مرکز اور ہدف نبی اکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی ذات کو اور آپ ﷺ کی رسالت کو بنا رکھا ہے۔

اسلام کے ابتدائی سالوں میں دمشق سے تعلق رکھنے والے سینٹ جان (۷۵۳ء) اور خلیفہ مامون کے ایک عیسائی درباری ابنِ اسحٰق عبد المسیح الکندی (۸۷۰ء) نے آپ ﷺ کی ذاتِ اقدس پر الزامات لگا کر اپنے دل کا بغض نکالا اور انہی دونوں کی غلیظ تصنیفات نے آگے

---

(۱) ابوداؤد: ''سنن ابوداؤد''؛ کتابُ الملاحم، باب فی تداعی الامم علی الاسلام

آنے والی صدیوں میں متعصب عیسائی پادریوں اور دانشوروں کی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف ہرزہ سرائی کے لیے مواد اور بنیاد فراہم کی۔ (۱) آج بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ گرامی مغرب کے حملوں کا ایک بڑا ہدف ہے۔ بلکہ اب اس میں اور زیادہ تیزی اور شدت آ گئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آج مسلمانوں کے خلاف عیسائیوں کی دشمنی کی نوعیت میں کچھ مزید عناصر کا اضافہ ہو گیا ہے۔

اسلام کے شروع کے ادوار میں جب محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نام لیواؤں نے دیکھتے ہی دیکھتے دنیا کے ایک بڑے حصے پر اسلامی فتوحات کے جھنڈے لہرائے تو ان کے مفتوحہ خطوں میں کئی ایسے تھے جو عیسائیت کے گڑھ تھے مثلاً فلسطین، مصر، شام، لیبیا، تیونس اور الجیریا۔ یہ علاقے نہ صرف جغرافیائی طور پر مسلمانوں کے زیرِ حکومت آئے بلکہ آبادیوں کی آبادیاں دلی رضا اور رغبت کے ساتھ رسولِ عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لائے ہوئے پیغام پر ایمان لے آئیں۔ غلامانِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی بے سروسامانی اور قلت کے باوجود جس طرح عیسائی سطوت وسلطنت کو زیر کر لینے میں کامیاب ہوئے اس پر مسیحی پادری وعلماء متحیر، شکست خوردہ اور غیض وغضب کا شکار تھے۔ انہوں نے جب مسلمانوں کی ان غیر معمولی کامیابیوں کی توجیہہ تلاش کرنی چاہی تو ان کو یہی نظر آیا کہ ان صحرا نشینوں کی قوت کا راز نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت پر غیر متزلزل ایمان اور آپ کی ذات سے والہانہ محبت، عقیدت اور وابستگی ہے۔ چنانچہ انہوں نے اپنا سارا زور یہ ثابت کرنے میں لگا دیا کہ (نعوذ باللہ) حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دعویٰ صداقت پر مبنی نہیں اور قرآن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تصنیف ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہودیوں اور عیسائیوں کی مذہبی کتابوں سے مختلف مضامین لے کر ترتیب دی ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذاتی کردار پر انتہائی رکیک الزامات لگائے۔

عیسائی علماء اور دانشوروں کی ان مذموم کوششوں کے باوجود بھی جب نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جاں نثاروں کی تعداد میں اضافہ ہی ہوتا رہا اور ہزار سال تک مسلمانوں کے عروج کا سورج نصف النہار پر چمکتا رہا تو ان کے بغض میں بھی اضافہ ہوتا رہا۔ استعمار کے اولین دور میں اس کے باوجود کہ مسلم امت ان گنت اندرونی کمزوریوں کا شکار ہو چکی تھی، قبضہ کاروں کو مسلمانوں کی

---

(۱) خرم مراد؛ ''مغرب اور عالمِ اسلام''، ص: 14-13

طرف سے جتنی شدید مزاحمتوں کا سامنا کرنا پڑا اس نے ان پر واضح کر دیا کہ صدیوں پہلے ان کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سکھائے ہوئے سبق ابھی بھی ان کے ذہنوں سے محو نہیں ہوئے۔ عام مسلمان ابھی بھی کفر کا غلام بننے سے زیادہ لڑ کر جان دے دینے کو بہتر سمجھتا ہے۔ اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت کا وہ سرچشمہ ابھی بھی خشک نہیں ہوا جہاں سے مسلمانوں کے جذبہ حریت اور جرأت کے سوتے پھوٹتے ہیں۔ پھر عصرِ حاضر میں تو جدید استعمار کے تمام تر مادی اور نفسیاتی حربوں کے باوجود آج بھی عام مسلمان نے اپنا تعلق کسی نہ کسی درجے میں اپنے نبی صلی اللہ علیہ والہ وسلم سے جوڑ کر رکھا ہوا ہے۔ اسی لیے آج مغرب نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسلام کی شان میں گستاخیوں اور شرارتوں کا ایک نیا سلسلہ شروع کر رکھا ہے۔

ڈنمارک، سوئیڈن، فرانس اور دنیا کے دیگر یورپی ممالک میں شائع ہونے والے توہین آمیز خاکوں اور نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات پر بنائی جانے والی پراپیگنڈہ فلموں کے پسِ منظر میں ایک مخصوص استعماری ذہنیت کارفرما ہے جس سے کئی مقاصد کا حصول مقصود ہے۔ سب سے پہلا مقصد تو یہی ہے کہ مسلمانوں کے دلوں میں ان کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عظمت کو گھٹایا جائے۔ لیکن اس ضمن میں مغرب انشاءاللہ منہ کی کھائے گا کیونکہ کمزور سے کمزور عقیدے اور کم سے کم دینی علم رکھنے والا مسلمان بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان میں گستاخی کو اپنی غیرت پر حملہ تصور کرتا ہے۔

مغرب کا ایک اور مقصد یہ بھی ہے کہ جس رفتار سے خود مغرب میں اسلام مقبول ہوتا جا رہا ہے اور آئے روز اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد بڑھ رہی ہے اس سے نپٹنے کے لیے اپنے عوام کے دل و دماغ میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسلام کے خلاف (نعوذ باللہ) حقارت اور غیر سنجیدگی کے جذبات کو فروغ دیا جائے۔ کیلیفورنیا سے تعلق رکھنے والے ڈاکٹر رابرٹ موری (Robert Morey.A) کی اسلام کے خلاف لکھی جانے والی کتاب (*Islamic Invasion*) کی تشہیری مہم میں اس کے پبلشر لکھتے ہیں کہ اسلام دنیا میں تیزی کے ساتھ پھیل رہا ہے۔ اس کے آگے بند باندھنے اور مسلمانوں کو عیسائی بنانے کے لیے ضروری ہے کہ مسلمانوں کے دین کی بنیادوں کو ہلا دیا جائے اور اسلام کے تین بنیادی عقائید کے پرخچے اڑا دیئے جائیں اور دنیا کو باور کرایا جائے کہ

۱۔ اللہ انجیل کا خدا نہیں ہے۔　۲۔ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خدا کے رسول نہیں تھے۔

۳۔ قرآن کلامِ الٰہی نہیں۔ (۱)

لہٰذا نبی ﷺ کی ذات پر مغرب کے رکیک حملے اور قرآن کو نبی ﷺ کی تصنیف ثابت کرنے کی کوشش درحقیقت مغرب کے اس خوف کا آشکار کرتی ہیں جو انہیں اسلام کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کے باعث لاحق ہے۔

مغرب کی ایک کوشش یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کے جذبات کو مشتعل کر کے انہیں متشدد کارروائیوں پر ابھارا جائے۔ نیز یہ بھی ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ کسی بھی برائی کو بار بار دہرایا جائے تو آہستہ آہستہ اس کے ''برائی'' ہونے یا قابل اعتراض ہونے کا تصور معدوم ہو جاتا ہے۔ ان گستاخانہ جسارتوں کو وقتاً فوقتاً دہرانے میں ایک یہ مقصد بھی پوشیدہ ہے۔ اور پھر سب سے اہم مقصد تو وہی قدیم مقصد ہے کہ آپ ﷺ کی سچائی اور دعویٰ نبوت کے برحق ہونے کو ہی مشکوک ٹھہرا دیا جائے تا کہ آپ ﷺ کی سنت کی اِتباع کا جذبہ مسلمانوں میں سرد پڑ جائے۔

توہینِ رسالت کے قوانین پر مغربی مما لک کا اعترض اور شور شرابہ بھی اسی مقصد کے لیے ہے تا کہ مسلمانوں کو ایک ''پسماندہ'' اور ''وحشی'' قوم ثابت کیا جائے اور یہ ثابت کیا جائے کہ مسلمان اور اسلام آزادئ اظہار رائے کے خلاف ہیں۔ لیکن مغرب کی ''آزادئ اظہارِ رائے'' کی اعلیٰ اقدار اس وقت مضحکہ خیز نظر آتی ہیں جب خود مغرب میں ہی یہودیوں کے جذبات کو ''ٹھیس پہنچانا'' ایک قابل سزا جرم بن جاتا ہے اور جب مغربی میڈیا اسلامی مما لک پر لگنے والی پابندیوں اور برسنے والے بموں کے نتیجے میں روتے، سسکتے مسلمان مردوں عورتوں اور بچوں سے ''صرفِ نظر'' کر لیتا ہے۔

غرض یہ کہ ''آزادئ اظہار رائے'' کے ''حق'' کا استعمال کرتے ہوئے دنیا کے پونے دو ارب باشندوں کے جذبات کو ٹھیس پہنچانا اور دنیا کی سب سے محترم اور مقدس ہستی کو استہزاء کا نشانہ بنانا، یہ آج کے استعمار کا ایک بے حد سوچا سمجھا منصوبہ ہے۔ یہ ان کے خبثِ باطن کا اظہار ہے ۔جس تہذیب کے ساتھ تصادم کے خوف نے مغرب کی نیندیں حرام کر رکھی ہیں اس تہذیب کا سرچشمہ نبی آخر الزماں ﷺ کی تعلیمات ہی ہیں۔ اسی لیے آپ ﷺ کی ذات مبارکہ کے خلاف آج کی باطل تہذیب کے علمبرداروں کا بغض چھپائے نہیں چھپتا۔

---

(۱) ڈاکٹر سعید احمد ملک؛ ''خونِ مسلم ارزاں ہے''؛ جاوید پبلشرز، لاہور، مئی ۲۰۰۳ء؛ ص: ۲۲۵

تفہیم مغرب　　سید خالد جامعی

مغربی تہذیب ۔ لبرل ازم کے نام پر جبر

مغربی لبرل ازم میں کیا سچ مچ آزادی ہے یا آزادی کے نام پر جبر ہے؟

مغربی لبرل ازم میں آزادی میں اضافے کی خاطر لذت و مسرت (To Maximize Pleasure) کے لیے پتنگ سے بچے کی گردن کاٹ دینا جائز ہے لیکن اگر کوئی اپنے پیغمبر کے لیے، ان کی شان قائم رکھنے کے لیے کسی کی گردن کاٹ دے تو وہ حرام ہے۔ مغرب اگر اپنے تصور خیر ''آزادی'' کے لیے لوگوں کی جان لے سکتا ہے تو اسلام اپنے تصور خیر ''بندگی'' اور ''محبت رسولؐ'' کے لیے کسی کی جان کیوں نہیں لے سکتا؟ جان دونوں لے رہے ہیں تو پھر اعتراض صرف اسلام پر کیوں؟ آزادی کے مغربی عقیدے پر کیوں نہیں؟

دو سال کے بچوں کو پوری دنیا کے ہر ملک، ہر شہر اور ہر گھر میں صبح سویرے مُکے، ٹھڈے، جوتے، تھپڑ، گھونسے لاتیں مار کر اور گالم گلوچ کر کے بستروں سے کھینچ کر اسکول کیوں بھیجا جاتا ہے؟ کیا یہ جبر اور دہشت گردی نہیں کہ ایک سگی ماں اپنے بچہ کو دہشت زدہ کر کے جبراً اسکول بھیج رہی ہے کیونکہ کوئی بچہ صبح اسکول جانا پسند نہیں کرتا۔ یہ آزادی کا جبر ہے۔ لیکن ہمیں قبول ہے مگر مذہب کا جبر قبول نہیں ہے۔ آزادی کے عقیدے کے لئے مذہب، روایات، اقدار، اخلاق پر پابندیاں قبول ہیں مگر اسلام کے عقیدے کی پابندیاں ناقابل قبول ہیں۔ جبر آزادی میں بھی ہے اور جبر مذہب میں بھی ہے۔ یہ ایمان اور عقیدے کا سوال ہے کہ کون سا جبر ہمیں قبول ہے؟ جبر کے بغیر دنیا میں کوئی تہذیب، ریاست، سلطنت، عقیدہ مستحکم نہیں ہو سکتا۔

لبرل ازم کا یہ دعویٰ کہ اس نے ہر قسم کے جبر سے آزادی دی ہے، جھوٹا دعویٰ ہے۔ مغرب کے بڑے بڑے فلسفی لکھ چکے ہیں کہ ماڈرن ازم اور لبرل ازم نے عیسائیت کے مذہبی جبر سے آزادی کے نام پر وہ جبر کیا ہے جس کا تصور عیسائیت میں تھا ہی نہیں۔ مثلاً انسان آج اپنی خواب گاہ میں بھی محفوظ نہیں ہے۔ امریکہ کے ہر شہری کے فون روزانہ ٹیپ کیئے جاتے ہیں۔ (بقیہ صفحہ نمبر: ۴۲)

تفہیم مغرب

Prof. Yuval Noah Hariry[1]

مصنوعی ذہانت (Artificial Intelligence)
مستقبل میں کیا گُل کھلائے گی؟

ہم نہیں جانتے کہ روزگار کی منڈی ۲۰۵۰ء تک کیا صورت اختیار کرے۔ اس بات پر عمومی اتفاق رائے ہے کہ دہی جمانے سے یوگا سکھانے تک، مشینیں اور روبوٹکس تقریباً ہر کام کی نوعیت اور زاویہ بدل دیں گی۔ تاہم اس تبدیلی کی نوعیت اور وسعت پر مختلف تصورات باہم متصادم ہیں۔ کچھ لوگ یقین رکھتے ہیں کہ ایک یا دو دہائیوں میں اربوں انسان معاشی طور پر بے کار ہو جائیں گے۔ جبکہ دیگر سمجھتے ہیں کہ آٹومیشن روزگار کے نئے ذرائع پیدا کرتا رہے گا، اور سب کی ترقی کا کچھ نہ کچھ بندوبست کر لیا جائے گا۔

کیا ہم واقعی ایک خوفناک تبدیلی کے قریب پہنچ چکے ہیں، یا پھر محض بے بنیاد ہوائی باتوں کی زد میں ہیں؟ ابھی کچھ کہنا مشکل ہے۔ آٹومیشن کے سبب، بڑے پیمانے پر بے روزگاری کے خدشات انیسویں صدی میں بھی تھے، مگر وہ کبھی حقیقت میں نہ ڈھل سکے۔ جب سے صنعتی عہد شروع ہوا، ہر وہ روزگار جو مشین نے چھینا، اس کی جگہ نیا روزگار پیدا کر دیا گیا۔ معیار زندگی ڈرامائی رفتار سے بہتر ہوا۔ مگر اس بار صورتحال برعکس ہے اور ایسا سمجھنے کی کافی معقول وجوہات ہیں۔ اس بار مشین درحقیقت گیم چینجر بننے جا رہی ہے۔

انسانوں میں دو طرح کی قابلیتیں ہیں۔ ایک جسمانی اور دوسری عقلی و ادراکی۔ ماضی میں مشینیں انسانوں سے جسمانی مہارتوں میں مقابلہ کرتی رہی ہیں، مگر انسان کی ذہانت اور منصوبہ بندی نے اُسے ہمیشہ بہت آگے خاص مقام پر رکھا ہے۔ جب زرعی و صنعتی روزگار مشینوں نے چھین لیے، تو انسانوں نے وہ سارے کام سنبھال لیے، جن میں دماغی صلاحیتیں درکار ہوتی ہیں۔ مگر اب مصنوعی ذہانت کا نیا نظام انسانوں کو اُن سب کاموں سے نکال باہر کرے گا جن میں دماغ استعمال ہوتا ہے۔ جسمانی و دماغی، ہم ان دو انسانی صلاحیتوں

---

[1] ترجمہ و تلخیص، ناصر فاروق، (بشکریہ معارف فیچر کراچی)

کے سوا کسی تیسری انسانی خاصیت سے واقف نہیں، جو اُسے انفو بائیوٹیک انقلاب سے محفوظ و مامون بنا سکے۔ [خالص مادی نکتہ نظر ہے۔ پروفیسر ہراری اور نظریہ ارتقا پر ایمان رکھنے والے حضرات روح کے قائل نہیں۔ مگر انسانوں کی بہت بڑی اکثریت، جو بڑے مذاہب سے تعلق رکھتی ہے، نہ صرف روح سے تعلق رکھتی ہے بلکہ اسے انسانی عزوشرف سمجھتی ہے، اور دیگر مخلوقات سے انسان کو ممتاز بنانے والی یہی وہ صفت ہے، جس کے بغیر انسان واقعی درندہ صفت نظر آتا ہے]۔

یہ سمجھنا انتہائی اہم ہوگا کہ مصنوعی ذہانت کا انقلاب صرف کمپیوٹر کی کارکردگی یا تیز رفتاری سے متعلق نہیں ہے۔ یہ علوم حیاتیات اور علوم سماجیات میں فیصلہ کن تبدیلیاں لانے کی توانائی سے بھرپور ہوگا۔ جیسا کہ ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ بائیوکیمسٹری کا مکینزم انسانی جذبات، خواہشات اور پسند ناپسند کو کس طرح تقویت دیتا ہے۔ بالکل اسی طرح کمپیوٹر بھی انسانی رویوں کا تجزیہ، انسانی فیصلوں کی پیش بینی اور انسانی ڈرائیوروں، بینکروں اور قانون دانوں کی جگہ سنبھال سکتے ہیں۔ [یہاں دو باتیں دلچسپ ہیں، ایک یہ کہ انسان کی آزاد خیالی کا مغربی تصور مادی نکتہ نظر سے ہی غلط ثابت کیا جا رہا ہے، دوسرا یہ کہ آزاد ارادے کا یہ اختیار اربوں نیورونز کو دیا جا رہا ہے اور ان کے اس اختیار پر قابو پانے کے لیے کیمیائی ہتھکنڈوں کے استعمال کو بائیو کیمسٹری کی اکادیمی اصطلاح میں قابل قبول بنا کر پیش کیا جا رہا ہے، یعنی پہلے انسان پر ظلم کے جو خارجی طریقے تھے، وہ اب ادویات اور طبی تشدد کی صورت اختیار کر لیں گے، حقیقت تو یہ ہے کہ عرصہ دراز سے ایسا ہی ہو رہا ہے، LSD کا استعمال اس کی واضح مثال ہے]۔

آخری چند دہائیوں میں نیوروسائنس اور معاشی رویوں کے علوم میں تحقیق سے یہ سامنے آیا ہے کہ سائنس دان بہت حد تک انسانی فیصلوں کو جاننے کے قابل ہو چکے ہیں۔ یہ بھی سامنے آ چکا ہے کہ خوراک سے لے کر باہمی تعلقات تک ہماری ہر خواہش کا تعلق کسی ’پراسرار آزاد ارادے‘ سے نہیں ہے، بلکہ یہ اربوں نیورونز کا وہ حساب وشمار ہے جو امکانات مدنظر رکھ کر لمحے بھر میں فیصلہ کرتا ہے۔ [پروفیسر صاحب کی دانشوری میں نیورونز کی شماریات کس قدر ’بصیرت افروز‘ شیخی کا ثبوت دے رہی ہے؟ اس کا ادراک انہیں واقعی نہیں ہے، مگر وہ انسانی

دماغ کی خودکاری ثابت کرنے پر جس جذبے اور لگن سے زور دیتے ہیں، وہ از خود 'خودکار مشینی' دماغ کی نفی کررہی ہے۔ ہماری اس رائے میں ہمارے نیورونز کی کوئی من مانی ہرگز نہیں ہے، یہ ہمارا یقین ہے، اگر ہمارا یہ یقین نیورونز کی شرارت ہے، تب بھی ہم یقین سے کیسے دستبردار ہوسکتے ہیں؟ اور مزے کی بات یہ کہ بصیرت کی شیخی بھی شیخی نہیں اگر وہ واقعی نیورونز کی شرارت ہے]۔

'انسانی بصیرت و وجدان' کی شیخی دراصل 'صورت یا نمونے کی شناخت' ہے۔ ماہر ڈرائیور، بینکار اور قانون دان کسی جادوئی سمجھ کے سبب ٹریفک، سرمایہ کاری اور بحث و دلائل ممکن نہیں بناتے، بلکہ متواتر پیش آنے والی صورتوں (عادتوں) کی شناخت کے ذریعہ لاپروا راہگیروں، ناتجربہ کار قرض خواہوں اور بددیانت عیار آدمی سے بچتے ہیں۔ یہ بھی واضح ہوچکا ہے کہ انسانی دماغ کے بائیوکیمیکل ایلگورتھم بےعیب نہیں ہیں [یہ عیب جاننے کا دعویٰ محل نظر ہے، کیونکہ اس طرح پروفیسر صاحب کا دماغ بھی بےعیب نہیں]۔ یہی وجہ ہے کہ ماہر ڈرائیور، سرمایہ کار اور قانون دان بھی احمقانہ غلطیاں کرجاتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ مصنوعی ذہانت انسانی دماغ کو بھی پچھاڑ سکتی ہے۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ مصنوعی ذہانت کو انسانی روح سے مسابقت کی کوئی ضروت ہوگی تو یہ ناممکن لگتا ہے! اور اگر (Artificial Intelligence:AI) کو واقعی انسانی نیورون سسٹم سے مقابلہ کرنا پڑ گیا، تو اس کے لیے یہ کوئی بڑی بات نہ ہوگی۔ [پروفیسر ہراری AI ورلڈ آرڈر کی خبر دے رہے ہیں]۔

بالخصوص یہ AI انسانوں کے بہت سارے ایسے کام سنبھال لے گی، جن میں جھوٹ فریب کے خدشات زیادہ ہوتے ہیں کیونکہ یہ AI انسانی کیفیات اور رویوں کا بہتر تجزیہ کرسکے گی۔ یہ بہترین ڈرائیور، بہترین سرمایہ کار اور بہترین قانون دان ہوگی۔ کون سا بچہ کب اچانک سڑک پر آسکتا ہے؟ اور کیا یہ سوٹڈ بوٹڈ شخص میرا پیسہ لے کر بھاگ تو نہیں جائے گا؟ اور کیا یہ وکیل محض دھمکیاں دے رہا ہے یا واقعی کچھ کرگزرے گا؟ اگر یہ جذبات اور رویے محض بائیو کیمسٹری ایلگورتھم کا نتیجہ ہیں، تو پھر انہیں سمجھنے میں کمپیوٹر کیوں انسانوں سے پیچھے رہ سکتے ہیں؟ یہ AI چہروں کے تاثرات تک پڑھ سکے گی، آواز کا اتار چڑھاؤ محسوس کرسکے گی، ہاتھ

پیروں کی حرکات سے اندازہ لگا سکے گی کہ سامنے والا کیسا ہے؟

مستقبل کی نوکریوں کو صرف انفوٹیک سے ہی خطرہ نہیں ہے بلکہ بائیوٹیک بھی بہت بڑی تبدیلیاں لا رہا ہے، دماغ کے سائنسدان ایسی چیزوں پر کام کر رہے ہیں، جو ۲۰۵۰ء تک ماہرین نفسیات اور محافظوں کی جگہ AI کی تقرری ممکن بنا دیں گی۔ AI میں صرف انسانی خوبیاں ہی نہیں بلکہ غیر انسانی صلاحیتیں بھی حیرت انگیز ہیں: ان میں سے ایک بہترین رابطہ اور دوسری اپ ڈیٹنگ کی اہلیت ہے۔ کروڑوں انسانوں کی جگہ سنبھالنے کے لیے کروڑوں روبوٹس یا کمپیوٹروں کی ضرورت نہیں۔ یہ ایک جدید نیٹ ورک کے ذریعہ بہت کچھ سنبھال سکیں گے۔ مثال کے طور پر ڈرائیور عموماً ٹریفک قوانین سے بہت زیادہ واقف نہیں ہوتے، حادثات کے خدشات ہمیشہ رہتے ہیں، جبکہ باہم ربط وضبط کا نظام AI خودکار گاڑیوں کو حادثات سے بہت زیادہ محفوظ رکھ سکے گا۔ اسی طرح جب عالمی ادارہ صحت کو کسی نئی بیماری یا دوا کا علم ہوگا، تو تمام ڈاکٹروں کو اس بارے میں اپ ڈیٹ رکھنا ناممکن ہوگا، جبکہ اس کے برعکس اگر دنیا بھر میں دس ارب AI ڈاکٹر بھی ہوں تو فوراً سب ہی اس بیماری اور دوا سے واقف ہو جائیں گے۔ اس سے انسانی معاشرے کو صحت عامہ میں بے حد فائدے حاصل ہو سکتے ہیں، انتہائی سستا علاج آسان ہوسکتا ہے۔ اسی طرح ٹرانسپورٹ کے شعبہ میں مصنوعی ذہانت کی خدمات انسانوں کے لیے بہت مفید ہوسکتی ہیں، کیونکہ یہ بہت فعال اور غلطیوں سے پاک ہوگی۔

انسانوں کا روزگار بچانے کے لیے ٹرانسپورٹ اور صحت عامہ کے شعبے میں مصنوعی ذہانت کا راستہ روکنا پاگل پن ہوگا۔ کیونکہ ہمیں انسانوں کو محفوظ بنانا ہے، روزگار کو نہیں۔ فارغ ڈاکٹر اور ڈرائیور کوئی اور کام بھی ڈھونڈ سکتے ہیں۔

مشینی موازرت

فوری طور پر مصنوعی ذہانت اور روبوٹکس تمام صنعتوں کو یکسر ختم نہیں کر رہے۔ روزمرہ کی وہ سرگرمیاں، جن میں اسپیشلائزیشن درکار ہوتی ہے، فی الحال وہی آٹومیشن پر جائیں گی۔ تاہم وہاں انسانوں سے مشینوں میں تبدیلی کافی دشوار ہوگی، جہاں کام کی ایسی مختلف نوعیتیں پیش آئیں گی، جن کا تعلق غیر معین صورتحال اور فیصلہ سازی سے ہوگا۔ مثال کے طور پر شعبہ صحت کو

لیجیے۔ زیادہ تر ڈاکٹر معمول کی معلومات پر ذمے داریاں ادا کرتے ہیں، میڈیکل ڈیٹا جمع کرتے ہیں، اس کا تجزیہ کرتے ہیں اور علاج تجویز کرتے ہیں۔ جبکہ نرسوں کا کام حساس ہوتا ہے، انہیں احتیاط سے تکلیف دہ انجکشن لگانے ہوتے ہیں، مریض کی نفسیاتی و اخلاقی مدد بھی کرنی ہوتی ہے اور غصیلے مریض پر قابو بھی پانا ہوتا ہے۔ لہٰذا، اس بات کا امکان زیاہ ہے کہ اسمارٹ فون پر خاندانی AI ڈاکٹر کا استعمال روبوٹک نرسوں سے دہائیوں پہلے شروع ہو جائے۔ انسانوں کی دیکھ بھال کا کام غالباً طویل عرصہ انسانوں ہی کے ذمے رہے گا۔ غالباً یہ انسانوں کی مزدور منڈی میں سب سے زیادہ فروغ پانے والا شعبہ قرار پائے۔

اس کے ساتھ ساتھ تخلیقی سرگرمیوں والے کام بھی فوری طور پر آٹومیشن پر نہ لائے جاسکیں گے۔ ہمیں انسانوں سے موسیقی خریدنے کی ضرورت نہیں رہی، وہ ہم آسانی سے ڈاؤن لوڈ کر لیتے ہیں، مگر موسیقار، گلوکار اور فنکار اب بھی گوشت پوست کے انسان ہی ہیں۔ ہمیں ان کی تخلیقی صلاحیتیں درکار ہوں گی۔

اس سب کے باوجود، کوئی بھی روزگار مکمل طور پر آٹومیشن سے محفوظ نہیں رہے گا۔ یہاں تک کہ فنکار بھی نوٹس پر چلے جائیں گے۔ عموماً سمجھا جاتا ہے کہ موسیقی انسانی جذبات کی ترجمانی کرتی ہے، مگر اس صورت میں کیا ہوگا جب خارجی ایلگورتھم انسانی جذبات سمجھنے لگیں گے، اور انہیں شیکسپیئر اور فریڈا کاہلو سے بہتر انداز میں پیش کریں گے؟

بہرحال، جذبات اب کوئی پراسرار شے نہیں رہے، یہ محض بائیوکیمیکل عمل ہے۔ بہت جلد مشینی ایلگورتھم سینسر کے ذریعہ ہمارے جسم کے بائیومیٹرک تجزیے کریں گے، پسند ناپسند اور موڈ کا پتا لگائیں گے اور اس کے مطابق مطلوبہ موسیقی سنوادیں گے، پسند کا گیت اور سُر تک الگ نکال کر مہیا کر دیں گے۔

نئی نوکریاں؟

شعبہ صحت اور تفریح میں روزگار کی کمی کو جزوی طور پر نئی نوکریوں سے حل کیا جائے گا۔ جنرل میڈیکل پریکٹیشنرز، جو عموماً مریضوں کی دیکھ بھال کرتے ہیں، وہ شاید مصنوعی ذہانت کی جگہ سنبھال سکیں۔ انسانی ڈاکٹر، لیب اسسٹنٹ وغیرہ تحقیق اور نئی دواؤں کی تیاری سے کافی

آمدنی پیدا کرسکیں گے۔ مصنوعی ذہانت شاید ایک اور طریقہ پر انسانی نوکریوں کا انتظام کرسکے، وہ یہ کہ انسان مصنوعی ذہانت سے مسابقت کے بجائے ان کی خدمات پر مامور ہوجائیں، ان کے معاون بن جائیں۔ مثال کے طور پر، ڈرون کی ایجاد نے انسانی پائلٹس کی نوکریاں ختم کیں، مگر ساتھ ہی مینٹیننس، ریموٹ کنٹرول، ڈیٹا کا تجزیہ، اور سائبر سکیورٹی جیسے شعبوں میں نئی اسامیاں پیدا کردیں۔ امریکی فوج میں ایک ڈرون کنٹرول کرنے کے لیے '۳۰' آپریٹر کام کرتے ہیں اور جائزہ و نتائج کے لیے '۸۰' افراد مامور ہیں۔ اگر صورتحال اسی طرح رہی، تو ۲۰۵۰ء تک جاب مارکیٹ میں انسانوں اور مصنوعی ذہانت کے درمیان مقابلہ کی فضا شاید پیدا نہ ہو، بلکہ تعاون واشتراک ہو۔ پولیس اور بینکاری کے شعبوں میں تعاون صرف انسانوں اور صرف کمپیوٹر دونوں کو مات دے سکتا ہے۔ تاہم ان سب نوکریوں کے ساتھ ایک مسئلہ درپیش رہے گا، وہ ہے انتہائی مہارت کا۔ روزگار کا حصول شاید پھر بھی اتنا مشکل نہ ہو، جتنا دشوار انسانوں کو ازسرنو تربیت دینا ہوگا۔ ماضی میں بھی آٹومیشن کی کئی لہریں آئیں، مگر ایک پیشے سے دوسرے پیشے میں منتقل ہونا چنداں دشوار نہ تھا۔ مگر ۲۰۵۰ء میں ایک کیشیئر یا ٹیکسٹائل ورکر۔۔۔ کینسر ریسرچر، ڈرون آپریٹر، یا آرٹیفیشل انٹیلی جنس بینکنگ ٹیم کا حصہ نہیں بن سکے گا، اس کے لیے غیر معمولی مہارت درکار ہوگی۔

اس طرح، انسانوں کے لیے بہت سی نئی نوکریوں کے باوجود عمومی صورتحال خوفناک ہوگی، شاید ایک بہت بڑا 'بے کار' طبقہ وجود میں آجائے۔ غیر تربیت یافتہ ملازمین اور بے روزگاری دونوں مل کر شاید بڑا بحران پیدا کردیں۔ کوئی بھی انسانی روزگار آٹومیشن سے ہمیشہ کے لیے محفوظ نہیں رہے گا۔۔۔ ۲۰۵۰ء تک نہ صرف 'تاحیات روزگار'، بلکہ 'تاحیات پیشہ' کا تصور بھی بالکل دقیانوسی ہوچکا ہوگا۔ ایسی صورتحال میں انسانوں پر ذہنی تناؤ بڑھے گا، بے روزگاری اور بے کاری کے ساتھ ساتھ ذہنی سکون کی ادویات کے استعمال میں بھی غیر معمولی اضافہ ہوگا۔ یقیناً ابھی، یہ باتیں قیاس آرائیاں ہیں۔ آٹومیشن نے صنعتوں میں ہلچل ضرور پیدا کی ہے، مگر روزگار کا بحران پیدا نہیں ہوا۔ ابھی یہ کہنا انتہائی دشوار ہے کہ مشینیں کب تک انسانوں کی جگہ لے لیں گی۔ اس کا بہت کچھ انحصار سیاسی فیصلوں اور ثقافتی تبدیلیوں سے ہی سامنے آئے گا، خاص طور پر ٹیکنالوجی کی پیشرفت اس حوالے سے فیصلہ کن ہوگی۔ تاہم ہم

خواب خرگوش کے مزے نہیں لے سکتے۔ یہ باور کرنا خطرناک ہوگا کہ روزگار کی کمی نئی نوکریوں سے پوری کر لی جائے گی۔ سیاسی اور سماجی انتشار اس قدر زیادہ ہے کہ سنجیدگی اختیار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

اکیسویں صدی میں انفوٹیک اور بائیوٹیک سے پیدا ہونے والا چیلنج ماضی کے کسی بھی صنعتی چیلنج سے زیادہ بڑا اور ہولناک ہے۔ اب ہم مزید جنگوں اور خونیں انقلابات کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ اس بار ناکامی نیوکلیائی جنگ کی صورت میں سامنے آئے گی، جینیاتی انجینئرنگ سے نہ جانے کیسے کیسے عفریت سامنے آئیں گے۔ کرہ ارض پر زندگی مکمل طور پر خطرے میں پڑ جائے گی۔

استحصال سے لاتعلقی تک

روزگار کے بحران سے بچنے کے تین راستے نظر آتے ہیں۔ نوکریوں کے زیاں سے بچنا قابل عمل اور دانشمندی نہیں، کیونکہ روبوٹکس اور مصنوعی ذہانت کے فوائد سے ہاتھ نہیں اٹھایا جا سکتا۔ حکومتیں شاید یہ کوشش کریں کہ آٹومیشن کے نفاذ کی رفتار سست رکھی جا سکے، تاکہ اچانک صدمات اور بھونچال سے بچا جا سکے۔ ٹیکنالوجی کبھی بھی جبر کی صورت نہیں بنی اور یہ کہ کچھ ہو سکتا ہے کا مطلب یہ نہیں کہ وہ لازماً ہوگا ہی۔ یہ ممکن ہے کہ حکومتیں ٹیکنالوجی کا راستہ کامیابی سے روک سکیں اور اس سے ضروری کمرشل اور معاشی فائدے بھی سمیٹ سکیں۔ جیسے انسانی اعضا کی خرید وفروخت کا راستہ سرکاری سطح پر روکا گیا ہے، جبکہ یہ اربوں کھربوں کا کاروبار بن سکتا ہے۔ اگر تبدیلی کا عمل سست کر دیا جائے، تو خاطر خواہ نوکریاں پیدا کی جا سکتی ہیں۔ مگر اس کے لیے بھی حکومتوں کو عمر بھر کی تعلیم کے لیے مکمل سہولیات کا انتظام کرنا ہوگا اور طویل عرصہ تک کے لیے سیفٹی نیٹ مہیا کرنا ہوگا تاکہ لوگ ٹیکنالوجی میں مہارتیں حاصل کر سکیں۔

تاہم یہ واضح نہیں کہ لوگ ساری زندگی تیزی کے ساتھ پیشہ ورانہ تبدیلیاں برداشت کر پائیں گے یا نہیں؟ یقیناً ایک بہت بڑا طبقہ ایسا نہیں کر پائے گا۔ تو پھر بے روزگار و بے کار دنیا کیا کرے گی؟ اس کے لیے نئے معاشرتی نمونے ڈھونڈنے ہوں گے، یا تیار کرنے ہوں گے۔ مگر اس سے بھی پہلے دیانت داری سے اعتراف کرنا ہوگا کہ موجودہ معاشی وسیاسی نظام

درپیش چیلنج سے نبرد آزما نہیں ہوسکتا۔

شاید کچھ لوگ کہیں کہ انسان کبھی بھی معاشی طور پر لاتعلق نہیں ہوسکتا، کیونکہ صارف تو وہی رہے گا۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ مستقبل میں انسانی صارفین کی ضرورت بھی شاید نہ رہے۔ روبوٹکس اور مصنوعی ذہانت کی اپنی دنیا اپنی ضروریات ہوں گی، وہ ایک دوسرے کے صارف بھی ہوسکتے ہیں۔شاید انہیں اس بات کی ضرورت ہی نہ ہو کہ انسان ان سے کچھ خریدیں۔ حقیقت یہ ہے کہ الگورتھم پہلے ہی تاجر اور بیوپار بن چکے ہیں، آج اسٹاک ایکسچینج میں وہ بانڈز کے اہم خریدار ہیں۔مثلاً اشتہار کی دنیا میں اس وقت سب سے بڑا خریدار گوگل سرچ انجن ایلگورتھم ہے۔ظاہر ہے ایلگورتھم ہوش وحواس نہیں رکھتا، نہ جذبات رکھتا ہے، نہ خواہشات [یہاں ہراری تضاد کا شکار ہورہے ہیں، پہلے باب میں اور دیگر مقامات پر وہ انسانی احساسات اور جذبات کو مشینی قرار دیتے رہے ہیں، اب یہاں انہیں اعتراف ہے کہ مشین کے کوئی جذبات اور خواہشات نہیں ہوتیں]، اور نہ ہی آئس کریم کھا سکتا ہے،مگر آج کی دنیا میں بہترین آئس کریم کون سی ہے؟ اس کا فیصلہ گوگل رینکنگ کرتی ہے۔میرا ذاتی تجربہ ہے کہ جب کوئی کتاب اشاعت کے لیے بھجواتا ہوں، تو ناشر کے ساتھ ساتھ ایلگورتھم کی مہارت درکار ہوتی ہے، جو زبان کی تصیح کرتا ہے۔

بہرصورت ہمیں روزگار سے زیادہ انسانوں کی فکر کرنی چاہیے۔اس کے لیے ہمیں انہیں لاتعلقی سے بچانا ہوگا، ایک ایسا معاشرتی نمونہ تیار کرنا ہوگا، جس میں بے روزگار دنیا کی جسمانی اور نفسیاتی بقا کا سامان وافر دستیاب ہوسکے۔اگر ہم عالمی سطح پر نئے متحد انسانی معاشرے تشکیل دینے میں کامیاب ہوجاتے ہیں، تو مصنوعی ذہانت اور ایلگورتھم وغیرہ ہمارے لیے نعمت سے کم نہ ہوں گے۔مگر یہ بات ہمارے لیے ہولناک ہوسکتی ہے کہ اختیارات سارے ایلگورتھم کے ہاتھوں میں چلے جائیں! اس طرح ڈیجیٹل ڈکٹیٹرشپ کا عروج ہوگا اور یہ لبرل کہانی کا افسوسناک اختتام ہوگا!

مطالعۂ کتاب		قیوم نظامی

مغربی جمہوریت کی ناکامیوں پر معروف فرانسیسی ماہر بشریات کی کتاب

The Age of Violence

The Crisis of Political Action and the End of Utopia

Alain Bertho

ہم مغرب کی ناکام اور مردہ جمہوریت سے چمٹے رہنے پر کیوں مصر ہیں؟

مشہور فرانسیسی ماہر بشریات ایلن برتھو نے اس کتاب میں جمہوری نظام کے نوجوانوں پر اثرات کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ اپنے سنجیدہ تجزیہ کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ وہ جمہوری نظام جس کے بارے میں بہت سی امیدیں اور توقعات وابستہ کی گئی تھیں کہ اس نظام سے دنیا کے انسان مطمئن ہوں گے اور وہ خوش گوار زندگی گزار سکیں گے مگر تجربات اور مشاہدات سے یہ ثابت ہوا ہے کہ جمہوریت کی موت واقع ہو چکی ہے اور وہ اپنے مطلوبہ نتائج پیدا نہیں کر سکی۔ دنیا بھر میں شہروں کی بڑھتی ہوئی آبادی نے جمہوریت اور جمہوری نظام کو برباد کر کے رکھ دیا ہے۔ نوجوان مایوس، محروم اور انتہا پسند ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ رویے پوری دنیا میں دیکھے جا رہے ہیں۔ شہروں میں امن، سکون اور نظم وضبط باقی نہیں رہا۔

مصنف کے مطابق جمہوری انتخابات سے شدت پسندی اور انتہا پسندی جنم لیتی ہے۔ ووٹروں میں امید اور عزم پیدا نہیں ہوتا بلکہ مایوسی اور انتشار میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ عالمی انتخابات کے نتائج سے یہ ظاہر ہوتا ہے کے انتخابات نوجوانوں کی زندگیوں میں کوئی تبدیلی نہیں لاتے اور وہ مایوس ہوتے جا رہے ہیں۔ ان کے اردگرد کے ماحول میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی اور نہ ہی حکومتوں کی منافقت ختم ہوتی ہے۔ سیاستدان عمومی طور پر گورننس کے بارے میں بے معنی بیانات جاری کرتے رہتے ہیں اور ان بیانات پر عمل درآمد نہیں کرتے۔ عوام کا سرکاری بیانات، اطلاعات اور اعداد وشمار پر اعتماد ختم ہو چکا ہے اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ حکومت ان کو سچ نہیں بتاتی۔ پارٹی منشور میں وعدے اور دعوے تو کیے جاتے ہیں مگر ان پر عمل درآمد نظر نہیں آتا۔ سیاستدان پروپیگنڈے کے لیے ایسے پرکشش الفاظ استعمال کرتے ہیں جن میں مغز، نیت اور جذبے کا فقدان ہوتا ہے۔ مصنف کے مطابق سوشل میڈیا نے دنیا بھر کے نوجوانوں کو بیدار کر دیا ہے اور وہ اصل حقائق جاننے لگے ہیں۔ ان حالات میں جمہوریت کے نام پر سیاست کی

منافقت اور دوغلہ پن تکلیف دہ بنتا جا رہا ہے۔ مصنف کے مطابق گلوبلائزیشن مسائل کی اصل جڑ ہے۔ دنیا سکڑ رہی ہے اور ریاستیں سمجھوتوں اور مصلحتوں کا شکار ہو رہی ہیں۔

پاکستان کے عوام اسلام آباد میں ہونے والے فیصلوں پر بیرونی اثرات واضح طور پر دیکھ رہے ہیں۔ ہمارا جمہوری نظام بیرونی مداخلت اور اثرات کو ختم کرنے میں ناکام رہا ہے۔ ہم نام نہاد جمہوریت کی وجہ سے اپنے فیصلے خود کرنے کی بجائے ڈکٹیشن لینے پر مجبور ہیں۔ دنیا بھر میں حکومتیں گلوبلائزیشن کی یرغمال بن چکی ہیں۔ سیاسی منافقت، جھوٹ اور ریاکاری نے صورتحال کو مایوس کن بنا دیا ہے۔ نمائندہ حکومتیں بے سود، بے اثر اور غیر فعال بن چکی ہیں۔ منافقت اور دوغلہ پن مایوسی کی آگ پر تیل چھڑک رہا ہے۔ نوجوان شدت اور انتہا پسندی پر مائل ہونے لگے ہیں۔ مصنف کے خیال میں مذہب کو شدت پسندی کا ذمہ دار قرار نہیں دیا جاسکتا بلکہ نوجوان سنگ دل اور استحصالی جمہوری سیاسی نظام سے بیزار ہو کر مذہب کو پناہ گاہ کے طور پر استعمال کر رہے ہیں۔ انتخابی نظام نوجوانوں کو مایوس کر رہا ہے اور ضرورت اس بات کی ہے کہ مذہب کو ذمہ دار قرار دینے کی بجائے جمہوری نظام پر نئے حالات کے مطابق نظر ثانی کی جائے تاکہ اس کے نتیجے میں نوجوان مایوسی سے باہر نکل کر مطمئن زندگی گزارنے کے قابل ہو سکیں۔

مصنف لکھتے ہیں کہ ۲۰۰۵ء میں فرانس میں فسادات ہوئے اور دو ہزار افراد کو گرفتار کیا گیا تو ابتداء میں ان فسادات کو مذہبی شدت پسندی سے جوڑا گیا مگر تحقیق سے ثابت ہوا کہ بیروزگاری، سماجی عدم مساوات، مذہبی منافرت، فرقہ واریت، اقلیتوں کی محرومی اور پولیس کلچر ان فسادات کا سبب تھے۔ دہشت گرد تنظیم داعش نے مغرب میں پلے بڑھے نوجوانوں کی ہمدردیاں حاصل کیں جو جمہوری سیاسی نظام کے باعث پیدا ہونے والی محرومیوں کی وجہ سے مایوس ہو چکے تھے اور حکومت اور عوام کے درمیان عدم اعتماد پیدا ہو چکا تھا۔ مصنف نے اپنی کتاب میں ۲۰۱۴ء کی رپورٹ کا حوالہ دیا ہے جس کے مطابق فرانس کے نوجوانوں کی اکثریت داعش کی ہمدرد بن چکی تھی۔ فرانس میں حجاب پر پابندی کی وجہ سے مسلم اقلیت کو مرکزی دھارے سے نکال دیا گیا جس کے منفی اثرات مرتب ہوئے۔ طالبات نے اسکولوں میں جانا بند کر دیا اور وہ گھر کی چار دیواری کے اندر بند ہو کر رہ گئیں۔ بیسویں صدی کی انقلابی تحریکیں بھی نوجوانوں کو مطمئن نہیں کر سکیں۔

مغربی جمہوریت کی ناکامی پر عالمی سطح پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اس غیر منصفانہ اور سنگدلانہ نظام کی وجہ سے دنیا کے ایک درجن افراد آدھی دنیا کے وسائل پر قابض ہو چکے ہیں۔

امیروں اور غریبوں کے درمیان فرق روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔ قائداعظم اور علامہ اقبال کے بیانات کتابوں میں محفوظ ہیں جن میں انہوں نے واضح اور دوٹوک الفاظ میں یہ فرمایا تھا کہ مغربی جمہوریت اور مغربی معاشی سرمایہ دارانہ نظام پاکستان کے عام آدمی کو مطمئن نہیں کر سکتا۔ ان کا فلسفہ حرف بحرف درست ثابت ہو چکا ہے مگر اس کے باوجود حکومتی اشرافیہ جمہوری نظام میں بامعنی اور بامقصد تبدیلیاں لانے پر آمادہ نہیں ہو رہی کیونکہ اس کے مفادات اسی نظام کے ساتھ وابستہ ہو چکے ہیں۔ موجودہ مغربی جمہوری نظام اور پاکستان دونوں اکٹھے نہیں چل سکتے اس لئے قومی مفاد کا تقاضا یہ ہے کہ اگر پاکستان ترقی اور خوشحالی کی شاہراہ پر گامزن ہونا چاہتا ہے تو اسے اپنے سیاسی نظام میں پاکستان کے عوام کے مزاج، کلچر، تاریخی ثقافتی روایات اور اسلام کے سنہری آفاقی اصولوں کے مطابق دوررس اور انقلابی تبدیلیاں لانا ہوں گی تاکہ نیا پاکستانی سیاسی نظام محرومیوں، مایوسیوں، شدت پسندی اور انتہا پسندی کو ختم کر سکے۔ پاکستان کے تمام افراد بلاامتیاز نئے سیاسی نظام کے حصہ دار اور شراکت دار ہوں اور پاکستان کے قومی وسائل کی تقسیم منصفانہ بنیادوں پر کی جا سکے۔ پاکستان کے افراد ترقی کریں گے تو پاکستان مضبوط اور مستحکم بن سکے گا علامہ اقبال نے کہا تھا۔

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارہ

پاکستان کے پڑھے لکھے اور باشعور افراد کا یہ قومی فریضہ ہے کہ وہ موجودہ مغربی جمہوریت میں بامقصد تبدیلیاں لانے کے لئے توانا اور بلند آواز اٹھائیں۔ خاموشی جرم ہے جس کی سزا تاریخ میں ہمیشہ پوری قوم کو ملتی رہی ہے۔ ایسے جمہوری نظام کو کیوں جاری رکھا جائے جس کے نتیجے میں پاکستان میں امیر اور غریب میں فرق روز بروز بڑھتا جا رہا ہے اور ۹۸ فیصد عوام کی زندگیاں ایک شاعر کے مطابق کچھ اس طرح ہو چکی ہیں کہ۔

اس دور میں زندگی بشر کی
بیمار کی رات ہو گئی ہے

فرانس کے ماہر بشریات کی کتاب پر سنجیدگی سے غور کرنے اور اس پر عمل کرنے کی ضرورت ہے۔ جمود اور تقلید پر مبنی رویے پاکستانی ریاست کی سلامتی کے لیے شدید خطرہ بنتے جا رہے ہیں، مغربی جمہوریت کی موت واقع ہو چکی، پاکستان کے عوام کب تک پرائی جمہوریت کی لاش کو اپنے کندھوں پر اٹھاتے رہیں گے؟ (بشکریہ نوائے وقت)